# فرد

شمارہ نمبر ۱۱۲ اکتوبر ۲۰۱۶ء

انڈویجوئل لینڈ
انفرادی آزادی کے لئے کوشاں

## ۔۔۔۔۔یہ مٹی بڑی زرخیز ہے۔

## دہشتگردی

## معلومات کا حق

## سیاست

## موسمیاتی تبدیلی

In collaboration with
Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT
Follow us on twitter and facebook INDIVIDUALLAND

# فرد

شمارہ نمبر ۱۲ اکتوبر ۲۰۱۶ء

## فہرست


| | |
|---|---|
| ازطرف مدیر | ۱ |
| خیبر پختونخواہ پولیس آرڈیننس | ۲ |
| کیا یہ بھی جرم ہے؟ | ۵ |
| مردم شماری | ۸ |
| موسمیاتی تبدیلی اور سیاسی جماعتیں | ۱۱ |
| گستاخی معاف! | ۱۳ |
| ڈی ایس این جی کا تحفظ | ۱۴ |
| رپورٹنگ اور ریٹنگ کی دوڑ | ۱۷ |
| میڈیا اور صنفی دقیانوسی تصورات | ۲۰ |
| بھگت سنگھ کون تھا؟ | ۲۳ |
| قاتل بھی ہو اور غیرت مند بھی؟ | ۲۶ |
| مظلوم ترین پیشے کے مظلوم ترین شخص کے نام | ۲۸ |
| مسترد کرنے کا حق | ۲۹ |
| پاک۔ترک اسکولز | ۳۲ |
| پیارے افغانستان کے نام | ۳۵ |
| معلومات کا حق | ۳۸ |
| دہشتگردی ایک کاروبار | ۴۱ |
| خطرات سے کیسے نمٹا جائے؟ | ۴۴ |
| مجرم کون؟ | ۴۹ |
| دی وسل بلوئر بل | ۵۲ |
| سیا(ہ)ست؟ | ۵۵ |



ایڈیٹر:
سندس سیدہ

کوارڈینیشن:
سید فہد الحسن

ڈیزائین
عدیل امجد، ڈاٹ لائنز

پبلشر:
انڈویجوئل لینڈ پاکستان

آئی ایس بی این ۹۷۸ ۹۶۹ ۹۵۸۲ ۴۱ ۷

Individualland
Creating space for the individual
مکان نمبر ۲۸۹، السٹونیا ایونیو، سفاری ولاز فیز ۳، بحریہ ٹاؤن اسلام آباد

Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT
کے تعاون سے

یہ میگزین فریڈرک نومین فاؤنڈیشن فار فریڈم کے تعاون سے تشکیل دیا گیا ہے۔ اس میگزین کا مواد اور مندرجات صرف اور صرف پروڈیوسر / مصنفین کے خیالات اور نتائج کی عکاسی کرتے ہیں۔

ازطرف مدیر

معزز قارئین!

ہم ایک جانب تو بے روزگاری کے خاتمے اور عوام کے لیے تعلیم اور صحت کے مواقعوں کی بات کرتے ہیں اور دوسری جانب مسائل کے حل کی بات کرتے ہیں۔ کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ اگر تمام مسائل حل ہو جائیں گے تو ملک وقوم کو کتنا نقصان بھگتنا پڑے گا؟ اگر شیاء خورد ونوش میں گندگی، ملاوٹ اور بے ایمانی ختم ہو جائے تو بیماریاں کم ہو جائیں گی، پھر ڈاکٹر کیا کریں گے؟ ملاوٹ والی اشیاء تیار کرنے جیسے کہ کھانے پکانے کا تیل اور ملاوٹ والے مرچ مصالحے وغیرہ کی بے شمار فیکٹریاں بند ہو جائیں گی تو کتنے لوگ بے روزگار ہو جائیں گے؟ میرے خیال سے یہ ہی وجہ ہے کہ ہم بے روزگاری کے خاتمے کے لیے اور ملک کی ترقی کے لیے اپنے اردگرد ہونے والے غلط کاموں کا ساتھ دے رہے ہیں، اسی لیے تو ہم آواز نہیں اٹھاتے، یا یہ کہنا بجا ہوگا تب تک آواز نہیں اٹھاتے جب تک ہمیں اس سے کوئی مفاد حاصل نہ ہوتا ہو۔ ہم تنقید تو کرتے ہیں کہ میڈیا کے مختلف ادارے اپنے اپنے مفادات کی بات کرتے ہیں لیکن اپنے گریبان میں جھانکیں تو یہ حقیقت بھی عیاں ہو جائے گی کہ ہم سب ہی مفاد پرست ہیں۔ میڈیا پر کوئی بھی مسئلہ سامنے لایا جائے اس کا حل اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتا جب تک ذمہ دار ادارے اور عوام مل کر کسی بھی مسئلے کے حل میں دلچسپی نہ لیں۔ اگر ہم یہ جان لیں کہ کوئی بھی بڑے سے بڑا یا چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ ہم سب کی زندگیوں کو متاثر کر رہا ہے تو ہم تبھی اس کے حل کے لیے کچھ کر سکیں گے ورنہ میڈیا پر شور مچتا رہے گا اور ہم آنکھیں اور کان بند کیے بیٹھے رہیں گے ایسی صورتحال میں کسی بھی معاملے کے حل ہونے کی توقع رکھنا بے فائدہ ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ ہمارے پاس قوانین موجود نہیں ہیں کہ مسائل حل نہ ہوسکیں قوانین بھی موجود ہیں جن میں سے چند ایکٹ، بل اور لاء پر آرٹیکل بھی اسی شمارے کا حصہ ہیں۔ ہمارے اور میڈیا کے مسائل، اداروں کے کردار، احتساب، معاشرے کے بگاڑ اور سدھار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لکھے گئے آرٹیکل لکھاریوں کی ذاتی رائے کی عکاسی کرتے ہیں۔ انڈیجوئل لینڈ کی ٹیم کی جانب سے کوشش کی گئی ہے کہ مختلف پہلوں جن میں مخنث برادری، خواتین، افغان مہاجرین، مردم شماری، میڈیا کے کردار اور میڈیا کے اداروں کے تحفظ پر نئے انداز سے آرٹیکل لکھے جائیں۔ امید ہے آپ کو ہماری ٹیم کی یہ کوشش پسند آئے گی۔

سندس سیدہ

# خیبر پختونخواہ پولیس آرڈیننس

انعم باسط

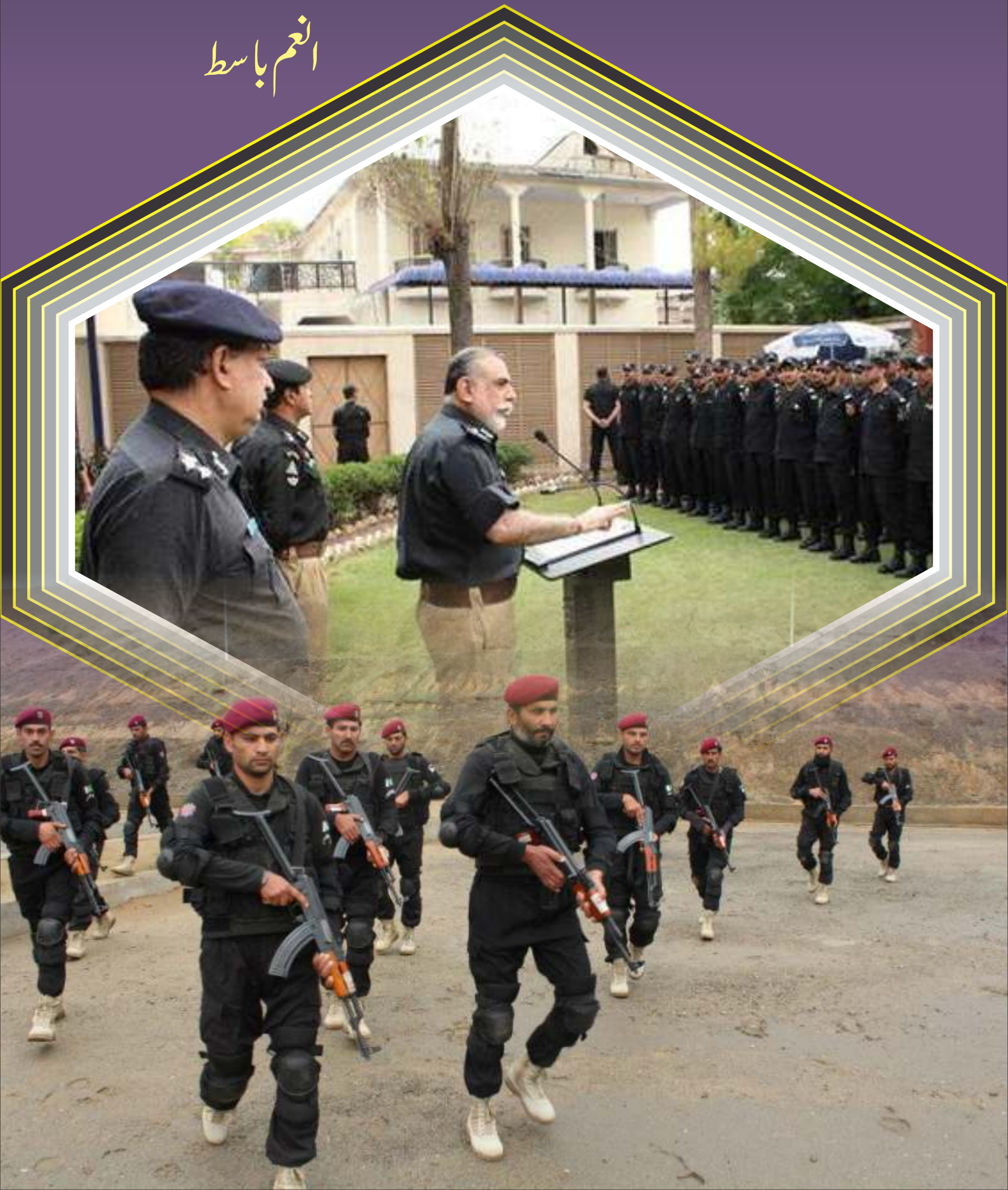

خیبر پختونخواہ پولیس آرڈیننس پہلا پولیس کا قانون ہے جو کہ صوبائی حکومت کی جانب سے مقامی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تشکیل دیا گیا۔ خیبر پختونخواہ میں موجودہ چیلنجوں جن میں بڑھتی ہوئی جرائم کی شرح اور عسکریت پسندی سرِ فہرست ہیں ان سے موثر طریقے سے نمٹنے کے لیے ضروری ہے قانون کی بالادستی کو یقینی بنایا جائے۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے گزشتہ تین سالوں میں کئی اقدامات اٹھائے گئے ہیں جن کو یکم اگست ۲۰۱۶ء میں آرڈیننس کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ خیبر پختونخواہ پولیس آرڈیننس کے مطابق پولیس کے قوانین اور ذمہ داریوں میں مختلف ترامیم شامل کی گئیں ہیں۔ اصلاحات کا بنیادی مقصد میں شہریوں کے لیے پولیس کے کردار کو زیادہ موثر اور عوام کے سامنے جوابدہ بنانے کے ساتھ ساتھ ماحول کو دوستانہ بنانا شامل ہے۔ اس آرڈیننس کو اسمبلی سے منظور کروانے کے لیے پولیس کے اعلیٰ عہدیداران پارلیمانی اسمبلی کے ممبران کے ساتھ لابنگ کر رہے ہیں تاکہ اس کو جلد از جلد منظور کروایا جا سکے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ یہ کام غیر سرکاری اداروں کی جانب سے کیا جاتا ہے لیکن ایک حکومتی تنخواہ دار کا اپنے ہی محکمے کے لیے آرڈیننس کو پاس کروانے کے لیے لابنگ کرنا کچھ منفرد عمل ہے جس پر سوالات اٹھائے جا رہے ہیں لیکن اس سوالات پر انسپکٹر جنرل خیبر پختونخواہ پولیس ناصر درویانی صاحب کا کہنا ہے کہ "اسمبلی میں بل پاس کروانے کے لیے لابنگ کرنا کوئی غلط کام نہیں ہے۔ بلکہ پوری دنیا میں متعلقہ ادارے بل پاس کروانے کے لیے لابنگ کرتے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ ایک دفعہ پولیس آرڈر پاس ہو جائے تو اس میں بعد میں ترامیم کروائی جا سکیں گی"۔ ہمارے ملک میں یہ ہی المیہ ہے کہ پہلے بل پاس کروا لیے جاتے ہیں اور بعد میں اس میں ترامیم کی جاتی ہیں جبکہ بل ایسے ہونے چاہیں جو کہ مستقبل میں کم از کم ۳۰ سال تک کی ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر بنائے جائیں۔ رہا بل پاس کروانے کا عمل تو اس میں بھی جمہوری طریقہ کار کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے جس پر پاکستان میں عمل ہوتا دیکھائی نہیں دے رہا۔ آخر پولیس کی جانب سے کسی نے تو یہ آرڈیننس اسمبلی میں پیش کرنا ہے اسی پر لابنگ کرنے کی بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ بحر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ اس آرڈیننس میں بہت بہترین شکیں موجود ہیں۔

موجودہ پولیس آرڈیننس کے سیکشن نمبر ۴ میں واضح کیا گیا ہے کہ پولیس کے فرائض میں عوام کے مسائل کے حل کی مد میں کن فرائض کی انجام دہی شامل ہو گی۔ ۲۰۰۲ء کے پولیس آرڈر میں انسداد عسکریت پسندی اور دہشت گردی سے نمٹنے کی شکیں موجود نہیں تھیں لیکن خیبر پختونخواہ پولیس آرڈیننس کے مطابق پولیس عسکریت پسندی کے خلاف عوام کا تحفظ فراہم کرنے کی پابند ہے۔ عسکریت پسندی سے نمٹنے کے لئے ایسے اقدامات کی اشد ضرورت ہے۔ قانون میں یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ پولیس کو انسانی حقوق کے محافظ کے طور پر کام کرنا چاہیئے۔ تاہم مثالیت کے حصول کے لیے پولیس کی مسلسل تربیت کی ضرورت ہے جن کا ذکر اس آرڈیننس میں شک نمبر ۱۲ (۴) اور (۷) میں کیا گیا ہے۔ اسی مد میں خیبر پختونخواہ میں ۹ سپیشل تربیتی اسکولوں کا قیام بھی کیا گیا ہے۔ جن میں سے ۷ اسکول کام کر رہے ہیں جن میں پولیس اسکول آف انویسٹیگیشن پشاور جون ۲۰۱۴ء سے، پولیس اسکول آف انٹیلیجنس جولائی ۲۰۱۴ء سے، پولیس اسکول آف ایکسپلوسیو ہنڈلنگ نوشہرہ فروری ۲۰۱۵ء سے، پولیس اسکول آف پبلک وِس آرڈر اینڈ ریوٹ مینجمنٹ مردان اپریل ۲۰۱۴ء سے، پولیس اسکول آف انفارمیشن ٹیکنالوجی پشاور ستمبر ۲۰۱۴ء سے، پولیس اسکول آف ٹیکٹکس پشاور اگست ۲۰۱۵ء سے اور ایلیٹ ٹریننگ اسکول نوشہرہ بھی کام کر رہے ہیں۔ ۹/۱۱ کے منظر نامے میں خیبر پختونخواہ میں افرادی قوت کو ۱۷ فیصد بڑھایا گیا ہے لیکن تربیت کے پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ تاہم، خصوصی تربیت کے اداروں کے قیام کے بعد خیبر پختونخواہ پولیس خصوصی فورس کو فعال بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ سیکشن ۱۴۴ کے مطابق امپلیمنٹیشن کمشنر مقرر کیا جائے گا جو کہ قوانین کے نفاذ کو یقینی بنائے گا۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں نچلی سطح سے بہتری لانے کے لیے کوششیں نہیں کی جاتیں۔ پولیس کے کردار کو بہتر بنانے کے لیے نچلی سطح سے اصلاحات کی جانے کی اشد ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر پولیس اسٹیشن اور جونیئر رینک کے عہدیداروں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ سیکشن ۳۲-۳۳ میں کانسٹیبلوں کی بھرتی اور ہیڈ کانسٹیبل کی تقرری اور بھرتی کے بارے میں بات کی گئی ہے لیکن ان کی پروموشن کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس کی مثال طاہر کی ہے جو کہ خیبر پختونخواہ پولیس میں کانسٹیبل ہے جس نے اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری جیو ٹیکنالوجی میں مکمل تو کر لی ہے لیکن ابھی بھی وہ کانسٹیبل کے عہدے پر ہے اور پروموشن کے انتظار میں ہے۔

یہ قانون تھانوں کے لیے سہولیات اور مالی وسائل کی فراہمی کو مدِ نظر رکھ کر عوامی خدمات کی فراہمی کو زیادہ موثر بنا سکے گا۔ فیصلہ سازوں کو ان امور کو مدِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ پولیس افسران کس طریقے سے ملزم کو گرفتار کر کے تھانے لاتے ہیں، عدالت یا جیل لے جانے اور لانے کے لیے، اسٹیشن ہاؤس آفیسر کس طرح لاشوں کو اور طبی قانونی رائے

اور علاج کے لیے زخمی کو ہسپتال پہنچانے کے مالی معاملات کا بندوبست کرتا یا کرتی ہے۔ ڈویژنل پولیس افسران اور ایس ایچ اوز کو مالی خودمختاری دی جانی چاہیئے تا کہ وہ اپنے طور پر تھانوں میں خدمات کی فراہمی کو بہتر بنا سکیں۔ سڑکوں پر کانسٹیبلوں کی تعداد میں کمی اور اسسٹنٹ سب انسپکٹر کے عہدے کے پولیس افسران کی تعداد میں اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

سیکشن ۴ (۲ بی اینڈ ڈی) میں سڑک پر ہونے والے حادثات کے متاثرین کو مدد فراہم کرنے کے لئے پولیس قانونی امداد اور نقل و حمل فراہم کرنے کی بھی ذمہ دار ہے۔ تاہم، یہ اس صورت میں ممکن ہوسکتا ہے جب پولیس کے پاس اپنی ایمبولینسیں اور ہائیڈرالک کٹر موجود ہوں۔ اگر احتساب کی بات کی جائے تو اس سلسلے میں پولیس سالانہ پولیسنگ پلان شائع کرے گی۔ سیکشن ۲۵ میں تفتیشی امور کو آپریشنل امور سے علیحدہ رکھنے کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ بہترین تفتیشی افسران کو تفتیشی انگ کا حصہ بنایا جائے۔ سیکشن ۴۴، قانون کے نفاذ میں پولیس کو بلدیاتی اداروں کی مدد کرنے کا جواز فراہم کرتا ہے۔ ایسی شکوں کو آرڈیننس میں ہونا اس آرڈیننس کو تشکیل دینے والوں کی دوراندیشی کی عکاسی کرتا ہے جنہوں نے قانون کے نفاذ میں بلدیاتی اداروں کی مدد کے لیے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی موجودگی کی اہمیت کو ضروری جانا۔ یہ آرڈیننس مقامی سطح پر قوانین کی بالادستی کے لیے یونین اور ضلع کونسل کی سطح پر مقامی پولیس کے قیام کا جواز فراہم کرے گا۔

اگر ہم خواتین پولیس کے حالات پر نظر دوڑائیں تو اس میں بھی بہت بہتری لانے کی ضرورت ہے۔ آرڈیننس میں خواتین پولیس کے حوالے سے ترامیم کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ خواتین پولیس کے تھانوں میں تمام سہولیات کی فراہمی کو یقینی بنانا اور وہاں تک مقامی لوگوں کی باآسانی رسائی کو یقینی بنانا نہایت اہم ہے۔ اب تک پشاور کے ۵۰۰ تھانوں میں خواتین کے لیے ہیلپ ڈسک کا قیام کیا گیا ہے لیکن اس سلسلے میں خیبر پختونخواہ کے دور دراز علاقوں کے ساتھ ساتھ ایبٹ آباد اور سوات جیسے اہم علاقوں کو بھی نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ خیبر پختونخواہ میں خواتین کے لیے کل ۲ تھانے موجود ہیں جن میں سے ایک پشاور میں اور ایک ایبٹ آباد میں ہے لیکن وہاں ایف آئی آر درج کرنے کی سہولت بھی موجود نہیں ہے کیونکہ ان تھانوں کو اب تک نوٹیفیکیشن جاری نہیں کیا گیا۔ پشاور کے خواتین کے تھانے تک تو عام لوگوں کی رسائی تک ممکن نہیں ہے۔

خیبر پختونخواہ کے پولیس آرڈیننس پر سب کی توجہ مرکوز ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کے نفاذ کے لیے تمام اسٹیک ہولڈرز مل کر کام کریں۔ مقامی سطح پر آرڈیننس کے نفاذ کے حوالے سے ہم نے نوشہرہ کے ایک شہری کا انٹرویو کیا، ان کا کہنا تھا کہ وہ پشاور میں پولیس کی کارکردگی سے بہت مطمئن ہیں۔ انہوں نے پشاور اور اسلام آباد میں پولیس کے ساتھ ہونے والے اپنے تجربے کے حوالے سے بتایا کہ اسلام آباد میں انہیں چند دستاویزات کی تصدیق کے لیے مختلف پولیس افسران سے ملنا پڑا جس کی وجہ سے ان کا بہت قیمتی وقت ضائع ہوگیا، اور انہیں ایسا محسوس ہوا کہ یہاں رشوت دیے بغیر کوئی بھی کام ممکن نہیں ہے۔ لیکن جب میں پشاور منتقل ہوا اور میں نے دستاویزات کی تصدیق کے لیے پشاور پولیس سے رابطہ کیا تو پشاور پولیس اسسٹنس لائنز پر موجود ہر افسر کا رویہ بہت اچھا تھا صرف یہ ہی نہیں بلکہ میرا تمام کام بہت اچھے طریقے سے بغیر رشوت دیے ہوگیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ کاش باقی صوبوں کی پولیس بھی پشاور پولیس کی طرح ہوجائے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ پورے نظام کو بہتر بنانے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سیکشن ۱۴۴ میں جس امپلیمنٹیشن کمشنر کا ذکر کیا گیا ہے اس کا کردار بہت اہم ہے کہ وہ آرڈیننس کے تحت ہونے والی پیش رفت کی جانچ پرکھ کی جاسکے۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی
حیثیت سے کام کررہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

# کیا یہ بھی جرم ہے؟

تحریر: سندس سیدہ

اعوانِ بالا کے بعد اب متنازعہ سائبر کرائم بل قومی اسمبلی سے بھی منظور ہو گیا ہے جس کے حوالے سے اسٹیک ہولڈرز کے بہت سے تحفظات ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس بل میں جن سزاؤں کا کہا جا رہا ہے وہ جرائم کے لحاظ سے بہت سخت ہیں۔ کسی بھی جمہوری ملک کا یہ حسن ہے کہ اس میں کوئی بھی قانون جمہوری طریقے سے منظور ہوتا ہے لیکن پاکستان میں جمہوریت کا جتنا برا حال ہے اس سے بھی برے طریقے سے اس بل کو منظور کروایا گیا ہے۔ بل کی تشکیل میں اسٹیک ہولڈرز کی سفارشات کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اسٹیک ہولڈرز کی جانب سے بیان کیے گئے چند خدشات یہ ہیں کہ اس بل کے قانون بن جانے کے بعد عام عوام کے لیے مشکل ہو جائے گی وہ نہ اپنی رائے کا اظہار کر سکیں گے، نہ ہی معلومات کی رسائی کا حق بہتر طریقے سے استعمال ہو سکے گا، صرف یہ ہی نہیں بلکہ سوشل میڈیا پر کسی کو ٹیگ کرنا، کسی کو پہلی مرتبہ ای میل بھیجنا، کاروبار کے لیے مارکیٹنگ کے طریقوں اور کسی بھی پوسٹ کو سوچے سمجھے بغیر شیئر کرنا بھی جرم کے ذمرے میں آ سکتا ہے۔ جبکہ حکومت حق بجانب ہے کہ انٹرنیٹ پر ہونے والے بے جا جرائم کی روک تھام اور عوام کے ساتھ ہونے والے الیکٹرانک جرائم کے تدارک کے لیے اس قانون کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال ہے کہ کیا واقعی الیکٹرانک جرائم کے تدارک کے اس بل سے تدارک ممکن بھی ہو سکے گا یا عوام کو مزید مشکلات برداشت کرنا پڑیں گی؟

اس بل کو پڑھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ عوام جس کے تحفظ کے لیے یہ بل بنا ہے بجائے اس کے کہ وہ اس بل سے فائدہ اٹھائیں، بل کے اطلاق کے بعد ہر شخص مجرم ہو گا۔ ہم وہ قوم ہیں جو ہر مسئلے کا عارضی حل تلاش کرتے ہیں کبھی بھی مسئلے کی نوعیت اور پیچیدگیاں نہیں سمجھتے جس کی وجہ سے مزید پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں۔ یہ ہی صورتحال سائبر کرائم کے تدارک کے بل کی ہے جو کہ قوانین اور آئین میں دی گئی اظہارِ رائے کی آزادی اور معلومات تک رسائی کو محدود کر دے گا۔ سوشل میڈیا پر اور آن لائن اظہارِ رائے کی آزادی کے حمایتی تو سہمے سہمے رہیں گے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ صحافیوں اور ذرائع کو نشانہ بنانے کے لیے بھی بل کا غلط استعمال کیا جا سکتا ہے جو کہ آزادیِ صحافت اور اظہارِ رائے کی آزادی کو محدود کر دے گا۔ بل میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کی بھی واضح طور پر تشریح نہیں کی گئی۔ کسی بھی جرم کی وجوہات اور اس کی نوعیت کی واضح تشریح نہیں ملتی نہ ہی بل کے نفاذ کا طریقہ کار واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ نہ ہی اس میں نگرانی کے معیارات خصوصی طور پر واضح کیئے گئے ہیں۔

اگر آپ کسی ایکٹیویٹی کی تصاویر پوسٹ کر رہے ہیں تو رکیئے! پہلے اس تصویر میں موجود افراد سے اجازت لے لیں۔ سیلفی لیتے وقت یاد رہے اس میں کوئی دوسرا نہ ہو، ورنہ پوسٹ کرنا مہنگا پڑ سکتا ہے۔ اگر آپ مارکیٹنگ کرنا چاہ رہے ہیں تو اس کے لیے بھی آپ کو اجازت لینا ہو گی کہ کوئی آپ کا پیغام سننا یا دیکھنا بھی چاہتا ہے یا نہیں؟ یاد رہے! سپیمنگ جرم ہے۔ آپ کسی کو سوشل میڈیا پر یا ای میل میں رسمی سلام دعا کی خاطر پہلی مرتبہ میسج بھیج رہے ہیں تو بھی خیال رہے اگر آپ کو جواب موصول نہیں ہوتا تو وہ شخص آپ کی جانب سے بھیجے گئے میسج کو آپ کے خلاف استعمال کر سکتا ہے اور آپ مجرم ہو سکتے ہیں۔ اس سے یہ مسئلہ یا تو حل ہو جائے گا یا مزید پیچیدہ ہو جائے گا کہ سوشل میڈیا پر انجان لوگوں کی جانب سے بھیجے گئے فضول میسج پر بھی کاروائی ہو سکتی ہے۔

اس بل میں پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی کو اختیارات دے دیئے گئے ہیں کہ وہ مواد کو ویب سائیٹ سے ہٹایا اس تک رسائی کو محدود کر سکتا ہے۔ لیکن یہ واضح نہیں کیا گیا کہ کن عناصر کو سامنے رکھتے ہوئے پی ٹی اے مواد کے قانونی یا غیر قانونی ہونے کا تعین کرے گا کسی بھی ادارے میں جو افراد ان امور کو سرانجام دے رہے ہوں گے ان کے لیے گائیڈ لائن نہیں ہیں جس کی بدولت ان کے ذاتی خیالات بھی کسی مواد کے قانونی یا غیر قانونی ہونے کا تعین کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ کیا پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی (پی ٹی اے) اس بات کا تعین کر سکتی ہے کہ کون سا مواد کس زمرے میں آتا ہے؟ کیا پی ٹی اے کے پاس اتنے وسائل ہیں؟ اگر ہاں تو ہمیں صباء کے نام سے آنے والی میسج جو کہ ۲۰ روپے کا لوڈ مانگتی ہے وہ کیوں موصول ہوتے ہیں؟ کیوں ہمیں بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کی جانب سے پیسے ملنے کے میسج موصول ہوتے ہیں؟ ایسا نہیں ہے کہ پی ٹی اے اپنا کام درست طریقے سے نہیں کر رہا بلکہ پاکستان میں بے شمار ایسی ویب سائیٹ، سوشل میڈیا پیج اور اکاؤنٹ گاہے بگاہے بند کیے جاتے رہتے ہیں جو کہ کسی کالعدم تنظیم یا فحش مواد کو شائع کر رہے ہیں۔ لیکن کسی بھی ادارے کو اضافی اختیارات دینے سے پہلے اس ادارے کے افراد کو تربیت دینا اور اس حوالے سے گائیڈ لائن عوام پر اور ادارے پر واضح کرنا نہایت ضروری ہے۔ ہم وہ قوم ہیں جن کو نہ تو اپنے آئین کے بارے میں آگاہی ہے نہ ہمیں قوانین کی معلومات ہے اس سے بھی بڑا ظلم

جو ہم اپنے ساتھ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے حقوق کا بھی نہیں پتہ، اس صورتحال کو سامنے رکھیں تو سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ بے شمار لوگ استعمال کر رہے ہیں اب ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے پورا بل پڑھیں ان کو مکمل معلومات ہوں کہ کیا جرم ہے اور کس قسم کی پوسٹ قانونی طور پر جائز ہے۔ یقیناً ایسا کرنا مشکل ہے ہر کوئی بل کو نہ ہی پڑھے گا اور نہ ہی سمجھ سکے گا جو کہ ان کی مشکلات میں اضافے کا سبب بن سکتا ہے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ کسی بھی الزام کی پہلے باقاعدہ تحقیق کی جائے گی لیکن اس ملک میں کسی جرم کے مرتکب ہونے کا الزام لگنا ہی سب سے بڑا جرم ہے۔ اس حوالے سے میڈیا کو بھی محتاط ہونا پڑے گا کہ کہیں کسی ایسے شخص کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو جس پر الزام لگ جائے لیکن وہ مجرم ثابت نہ ہو۔

معلوماتی نظام کی مدد سے نابالغ یا نابالغ نظر آنے والے افراد کی جنسی عمل میں مشغولیت کی تصاویر یا ویڈیو پھیلانے، اسے اپنے پاس رکھنے یا دوسروں کو دینے یا ایسے نابالغ افراد کی شناخت ظاہر کرنا جرم ہے لیکن اس میں صرف بچوں یا نابالغوں کا لفظ استعمال کیا گیا ہے بالغوں کی عریاں تصویر کشی کرنے کی شک شامل نہیں ہے۔ بل میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کے واضح ہونے کے ساتھ ساتھ سائبر جرائم، سائبر جنگ اور سائبر دہشتگردی کے حوالے سے تفصیلاً شکوں کو واضح کرنے کی ضرورت موجود ہے۔ ہمیں الیکٹرانک جرائم کے تدارک کے بل کی اشد ضرورت ہے اور اس پر عمل درآمد بھی ہونا چاہیئے لیکن بل ایسا ہو جو عوام کو سہولت دے نہ کہ ان کی مشکلات میں اضافہ کا سبب بنے۔ اگر ادارے اپنی ذمہ داری نہیں نبھائیں گے تو تحریکِ طالبان پاکستان ریڈیو پوڈ کاسٹ کو سوشل میڈیا اور ویب سائیٹ کے ذریعے پھیلاتی رہ جائے گی اور عام عوام مشکلات کا شکار رہے گی۔ اس پر حکومت کو سنجیدگی سے ایکشن لینے کی ضرورت ہے کیونکہ سوچنے کا وقت اب ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔ ہم یہ کسی طور نہیں چاہتے کہ بجلی، پانی اور گیس کے بلوں کے ساتھ ساتھ اب اسمبلیوں میں پیش ہونے والے بل بھی عوام کی مشکلات میں اضافے کا سبب بنیں۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی
حیثیت سے کام کر رہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

# مردم شماری

ماریہ افتخار

مردم شماری آبادی کی عمر، جنس اوران کی تعلیمی قابلیت کو جانچنے کے عمل کو کہتے ہیں۔اس معلومات کے ذریعے حکومت اور دیگر اداروں کے لئے وسائل مختص کرنا آسان ہو جاتا ہے۔مردم شماری کے ذریعے کسی بھی آبادی کے حال اور مستقبل کے بارے میں اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے۔مردم شماری کے ذریعے آبادی کی تشخیص کی جاتی ہے، یہ اعداد وشمار جمع کرنے کا ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے کسی بھی آبادی کی پیش رفت کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔جیسے پہلے ذکر کیا گیا کہ مردم شماری وسائل کو مختص کرنے میں مدد کرتی ہے جس سے آبادی کو بھی فائدہ ہوتا ہے۔مردم شماری کے ذریعے نا صرف معاشرے میں موجود عدم توازن کے بارے میں پتا چلتا ہے بلکہ یہ اس عدم توازن کو کم کرنے کے لیے پالیسی سازی کے عمل میں بھی مدد ملتی ہے۔مردم شماری آبادی کو درپیش مسائل کے بارے میں شماریاتی وضاحت فراہم کرتی ہے اور مسائل کے حل میں مدد کرتی ہے۔

پاکستان ایک متنوع اور کثیر ثقافتی معاشرہ ہے جہاں ہر مذہبی یا نسلی گروہ کے اپنے مطالبات اور ضروریات ہیں۔مردم شماری مختلف کمیونیٹیز کی تفصیلات اور ضروریات کے بارے میں جاننے میں مدد کرتی ہے۔وہ ان علاقوں کی بھی نشاندہی کرتی ہے جہاں پر عدم توازن برقرار ہے اور اسے کس طرح سے حل کیا جا سکتا ہے، مثلاً پاکستان کی اکثریت ہندو آبادی سندھ میں رہتی ہے اور یہ ہندو پاکستان کی کل آبادی کا ۸.۵ فیصد ہیں۔پاکستان جب سے وجود میں آیا ہے اس وقت سے ہندو اور دیگر اقلیتیں جیسے سکھ اور پارسی سرکاری طور پر اپنی شادیاں رجسٹر کروانے سے قاصر رہے ہیں۔سندھ اسمبلی نے جبری شادیوں کے حوالے سے بڑھتے ہوئے دباؤ کے پیش نظر فروری ۲۰۱۶ء میں ہندو میرج بل پیش کیا اور اب یہ بل قومی اسمبلی میں منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔

۱۹۹۸ء کی مردم شماری کے اعداد وشمار سے معلوم ہوتا ہے کے ملک کی اکثریت آبادی دیہی علاقوں میں رہتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کے دیہی علاقوں کی آبادی ملک کی حقیقی نمائندہ ہے۔پچھلے سالوں کے اقتصادی سروے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیہی علاقوں کے مقابلے میں شہروں کی خواندگی کی شرح زیادہ ہے۔۱۹۹۸ء سے ۱۹۹۹ء تک بالغ خواندگی کی شرح دیہی علاقوں میں ۳۶ فیصد تھی جب کہ شہری علاقوں میں ۶۵ فیصد۔۲۰۱۱ء سے ۲۰۱۲ء تک دیہی علاقوں میں خواندگی کی شرح ۴۹ فیصد تھی جب کہ شہری علاقوں میں ۷۵ فیصد تھی۔۲۰۱۲ء سے ۲۰۱۳ء تک دیہی علاقوں میں خواندگی کی شرح ۵۱ فیصد تھی اور شہری علاقوں میں ۷۶ فیصد۔۲۰۱۳ء سے ۲۰۱۴ء کے درمیان دیہی علاقوں میں خواندگی کی شرح ۴۹ فیصد تھی جب کہ شہری علاقوں میں ۷۴ فیصد تھی۔اگر یہ اسی طرح چلتا رہا تو اس سے دیہی اور شہری علاقوں کے درمیان اقتصادی خلیج بڑھے گی جس کے نتیجے میں ملک کی معیشت کو بھی نقصان ہوگا اور دیہی علاقوں میں معیار زندگی بھی نیچے چلا جائے گا۔ان محرومیوں کو مردم شماری کے ذریعے دور کیا جا سکتا ہے۔یہ سروے دیہی علاقوں کی تعلیمی پالیسی بنانے میں اور اصلاحات میں مدد کر سکتا ہے۔تعلیم کے علاوہ صحت کے نظام میں بھی مردم شماری کے تحت بہتری آسکتی ہے۔نئے ہسپتال اور میڈکل اسٹاف کی ضروریات کو بھی مردم شماری کے ذریعے جانچا جا سکتا ہے۔

بدقسمتی سے پاکستان میں پچھلے ۱۸ سال سے مردم شماری نہیں ہوئی ہے۔ملک میں کامیابی سے صرف پانچ بار مردم شماری کی جا سکی ہے۔آخری مردم شماری ۱۹۹۸ میں ہوئی تھی۔جب سے ملک کی آبادی تیزی سے بڑھنے لگی ہے یہ ضروری ہے کہ اسے ریکارڈ کیا جائے تا کہ سماجی ومعاشی پالیسیوں پر عمل درآمد ہو سکے تا کہ وسائل منتقل کرنے میں آسانی ہو اور ہر صوبے کو اس کے وسائل کا منصفانہ حصہ مل سکے۔ایجنڈا ۲۰۳۰ء کے تحت اگلے پندرہ سال کی پالیسی بنانے کے لیے عالمی اہداف مقرر کیئے گئے ہیں۔یہ اہداف ترقی کی تین اہم اطراف جیسا کہ ماحولیاتی، سماجی اور اقتصادی ترقی کے حوالے سے پالیسی بنانے میں مدد کریں گے۔یو این ڈی پی نے ترقی کے جو اہداف مقرر کیئے ہیں جن میں تعلیم کو ترجیح دینا، روزگار کے زیادہ مواقع فراہم کرنا شامل ہیں، ان کو حاصل کرنے کے لیے آبادی سے متعلق اعداد وشمار کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔مارچ ۲۰۱۶ء میں پائیدار ترقی کے اہداف کے حصول کے لیے مردم شماری ضروری تھی لیکن وزیر اعظم کی صدارت میں ایک میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ عملے اور فوجی اہلکاروں کی عدم دستیابی کی وجہ سے اسے ابھی موخر کر دیا جائے کیونکہ مردم شماری کے انعقاد کے لیے کافی انسانی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔لیکن یہ سب بہانہ ہے اگر بلدیاتی انتخابات مختلف مراحل میں کروائے جا سکتے ہیں تو مردم شماری کیوں نہیں کروائی جا سکتی۔یہ ان اداروں کی نااہلی کو ظاہر کرتی ہے جو مردم شماری کے لئے ذمہ دار ہیں۔

حکومت کے لیے لازمی ہے کہ ہر دس سال بعد مردم شماری کروائی جائے لیکن پچھلے ۱۸ سال سے مختلف حکومتوں نے مردم شماری نہیں کروائی۔ ۲۰۱۰ء میں ای سی پی نے وزیر اعظم کو مردم شماری کے حوالے سے ثمری بھیجوائی تھی لیکن مشترکہ مفادات کونسل نے مردم شماری نا کروانے کا فیصلہ کیا۔ مردم شماری نا ہونے کی وجہ سے ای سی پی نے ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں حلقوں کو ری ڈسکرائب کیا جہاں صوبائی حکومت نے نئی تحصیلیں بنائی تھیں۔ ۲۶ اگست ۲۰۱۶ء کو سپریم کورٹ آف پاکستان نے مردم شماری نا کروانے پر حکومت کو ذمہ دار ٹھرایا اور حکومت کی ۲۰۱۷ء میں مردم شماری کروانے والی رپورٹ کو مسترد کر دیا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ سیاسی جماعتیں مردم شماری حلقہ بندیوں سے بچنے کے لیے نہیں کرواتی۔ ۲۰۱۸ء کے انتخابات میں اب تھوڑا عرصہ ہی رہ گیا ہے اور نئی مردم شماری کروانے سے سیاسی جماعتیں کمزور ہو جائیں گی۔ آبادی میں تبدیلی جیت کو ہار میں بدل سکتی ہے۔

مردم شماری کروانے میں ایک اور دشواری یہ ہے کہ پاکستان بیورو آف اسٹیٹسٹکس کے پاس اتنا عملہ نہیں ہے اور جو فیلڈ اسٹاف ہے وہ عارضی طور پر رکھا جاتا ہے۔ یقیناً ٹیکنالوجی نے ہماری زندگیاں بدل دی ہیں اور مردم شماری کیلئے بھی ہمیں ٹیکنالوجی سے مدد لینا ہوگی۔ موجودہ حالات میں آبادی پر اعداد و شمار جمع کرنے کے لیے متبادل طریقے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ سکول، ہسپتال، نادرا جیسے ادارے ڈیٹا حاصل کرنے کے لیے اکٹھا کام کر سکتے ہیں۔ شہریوں کو مردم شماری کے حوالے سے ذمہ داری لینی ہوگی، اس کے لیے ان کو عدالت سے رجوع کرنا ہوگا کیونکہ آئین شہریوں کو تحفظ فراہم نہیں کرتی اگر حکومت دس سال کے وقت میں مردم شماری نہ کروائے تو شہریوں کو اپنا کردار ادا کرنا پڑے گا۔ شہریوں اور ریاستی اداروں کو اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے اکٹھے کام کرنا ہوگا۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی
حیثیت سے کام کر رہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

# موسمیاتی تبدیلی
# اور
# سیاسی جماعتیں

ذوالفقار حیدر

پچھلے کچھ عرصے سے وفاق اور صوبائی سطحوں پر شجر کاری مہمات کی کافی دھوم ہے۔ نا صرف حکومتی سطحوں پر بلکہ ایک خبر کے مطابق تو پنجاب رینجرز بھی گزشتہ بہار بارڈر ایریاز میں شجر کاری مہم کا انعقاد کر چکی ہے۔ یقیناً یہ خوش آئیند اقدامات ہیں مگر کیا یہ اقدامات موسمیاتی تبدیلی کے بڑھتے ہوئے اثرات کے پیشِ نظر کافی ہیں؟ یہ جاننے کے لئے ضروری ہے کہ حکومتی سطحوں پر اس مسئلے کو تفصیلاً سمجھا جائے اور آنے والے چند سالوں بلکہ دہائیوں کے لئے لائحہ عمل بھی تیار کیا جائے تا کہ آنے والی نسلوں پر اس تبدیلی کے اثرات کو کم کیا جا سکے۔ مگر کیا اقتدار کے ایوانوں میں اس مسئلے کو سنجیدگی سے دیکھا جا رہا ہے؟ یقیناً بین الاقوامی سطح پر بڑھتے ہوئے دباؤ کے پیش نظر پاکستان میں بھی حکومتی سطح پر کچھ پیش رفت دیکھنے میں آ رہی ہے، مگر کیا یہ پیش رفت صرف دکھاوا ہے یا واقعی ہماری حکومتیں اس مسئلے کے بارے میں سنجیدہ ہیں؟ یہ جاننے کے لیئے انڈیجینس لینڈز نے ضروری سمجھا کہ پاکستان کی ہر بڑی سیاسی جماعت کی جانب سے جاری کردہ سیاسی منشور کا موسمیاتی تبدیلی کے نقطہ نظر سے تجزیہ کیا جائے۔ اس تجزیے کا مقصد یہ جاننا تھا کہ کیا ہمارے ملک کی بڑی سیاسی جماعتیں موسمیاتی تبدیلی کے حل کے لئے سوچ بھی رہی ہیں یا نہیں۔ اس تجزیے کو چار سطحوں میں تقسیم کیا گیا، جس میں کور، پرائمری، سیکنڈری اور ٹرشری الفاظ شامل ہیں۔

انڈیجینس لینڈز نے کور، پرائمری، سیکنڈری اور ٹرشری الفاظ کی مدد سے کُل پندرہ (۱۵) میں سے تیرہ (۱۳) جماعتوں کے منشور کا تفصیلی تجزیہ کیا۔ دو (۲) جماعتوں، بلوچستان نیشنل عوامی پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ ضیاء نے سیاسی منشور تشکیل دینے ضروری نہیں سمجھا۔ کور الفاظ میں دو الفاظ یعنی کہ موسمیاتی تبدیلی اور ماحولیات شامل کیے گئے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ قومی سطح کی پارٹیوں کے علاوہ کسی نے بھی لفظ موسمیاتی تبدیلی کا اپنے منشور میں ذکر نہیں کیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرینز نے کُل نو (۹) دفع موسمیاتی تبدیلی کا ذکر کیا، جبکہ پاکستان مسلم لیگ نواز اور پاکستان تحریک انصاف نے کُل دو دو دفع اس لفظ کا استعمال کیا۔ البتہ لفظ ماحولیات کا ذکر قومی سطح کی اکثر و بیشتر تمام جماعتوں نے کیا۔ البتہ یہ لفظ سب سے زیادہ پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرینز نے (۲۸) دفع کیا اور سب سے کم قومی وطن پارٹی نے (۱) دفع کیا۔ سیاسی منشوروں کا مزید گہرائی سے تجزیہ کرنے پر معلوم ہوا کہ پی پی پی نے لفظ میٹیگیشن کا دو بار ذکر کیا جبکہ پی ٹی آئی نے یہ لفظ ایک بار استعمال کیا۔ اسی طرح پی پی پی نے لفظ سیلاب کا ذکر تیرہ (۱۳) بار جبکہ جماعت اسلامی نے ایک بار کیا۔ رینیوئیبل ایز جی کا ذکر سب سے زیادہ پی ایم ایل این نے سولہ (۱۶) بار کیا، جبکہ مجلس وحدت مسلمین اور جماعت اسلامی نے ایک ایک بار کیا۔ اسی طرح لفظ لائیوسٹاک کا ذکر سب سے زیادہ پی پی پی نے گیارہ مرتبہ کیا جبکہ پی ایم ایل کیو اور پختونخواہ ملی عوامی پارٹی نے یہ لفظ ایک ایک بار استعمال کیا۔ پینے کا پانی کا ذکر سب سے زیادہ پی پی پی، پی ایم ایل کیو اور پختونخواہ ملی عوامی پارٹی نے تین تین بار کیا، جبکہ لفظ قدرتی آفات کا ذکر پی پی پی نے دو بار جبکہ پی ٹی آئی نے تین مرتبہ کیا۔ اس تجزیے سے یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ پی پی پی قومی اور صوبائی سطحوں پر وہ واحد جماعت ہے جو موسمیاتی تبدیلی کو سنجیدگی سے دیکھ رہی ہے۔ یہی تاثر ہمیں سیاسی جماعتوں کے ارکان سے بات چیت کرنے کے بعد ملا۔ جیسا کہ پی پی پی کی دوسری حکومت کے دوران ماحولیات قوانین پر خاطر خواہ پیش رفت دیکھنے میں آئی اور انڈیجینس لینڈز کی سیاسی جماعتوں سے گفتگو کے دوران بھی یہی معلوم ہوا کہ پی پی پی سے تعلق رکھنے والے ارکان اس سلسلے میں خاصی معلومات بھی رکھتے ہیں اور اس معاملے کو لے کر سنجیدہ بھی ہیں۔

اگر پچھلی ایک دہائی کا جائزہ لیا جائے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ پاکستان میں سیلاب کی تباہ کاریوں میں اضافہ ہوا ہے جس کی وجہ گرمی میں غیر معمولی اضافہ اور پاکستان کے شمالی علاقوں میں واقع گلیشیئرز کا تیزی سے پگھلنا ہے۔ اس سال بھی چترال میں غیر معمولی سیلاب آیا جس نے بڑی سطح پر تباہی مچائی۔ پچھلے سال کراچی میں آنے والی گرمی کی لہر نے ایک ہزار سے زائد افراد کو لقمہ اجل بنا دیا۔ جنگلات کی کٹائی میں ہوشربا اضافہ اور جنگلی حیات کی تعداد میں کمی، یہ تمام مسائل موسمیاتی تبدیلی کے بڑھتے ہوئے اثرات ہیں۔ یقیناً سیاسی جماعتیں ان مسائل کے حل کے لئے پہلا دروازہ ہیں، اسی لئے اُن کے لئے موسمیاتی تبدیلی کو سمجھنا نہایت اہم ہے۔ اسی طرح عوام کو بھی اپنی سطح پر اپنی نمائندہ جماعت پر دباؤ ڈالنا بہت ضروری ہے تاکہ وہ موسمیاتی تبدیلی کو ایک عوامی مسئلہ سمجھنا شروع کریں اور اس کے حل کے لئے ہر ممکنہ کوشش کریں۔ سیاسی جماعتیں ہر سال الیکشنوں سے پہلے عوام سے ڈھیروں وعدے کرتی ہیں کہ اس سال لوڈشیڈنگ کا خاتمہ کر دیا جائے گا، ڈیم بنائے جائیں گے اور زراعت کے شعبے میں انقلاب لایا جائے گا مگر ایسا نہیں ہوتا۔ عوام ان جماعتوں کو ووٹ تو دے دیتے ہیں مگر یہ جماعتیں اپنے وعدے بھلا دیتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام پستے رہتے ہیں۔ اسی لیے یہ ضروی

ہوتا جا رہا ہے کہ عوام میں یہ شعور بیدار کیا جائے کہ سیاسی منشوروں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اور ہر سال الیکشنز سے پہلے ان سیاسی جماعتوں کو پچھلے سال کیئے گئے وعدے یاد کروائے جائیں تاکہ ایک موازنہ کیا جا سکے اور اسی موازنے کے پیش نظر عوام آنے والے وقت کے اپنے حکمرانوں کا انتخاب کرے۔ یہی ایک ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعے عوام جمہورت کے ثمرات سے لطف اندوز ہو سکتی ہے۔

موسمیاتی تبدیلی ایک ایسا مسئلہ ہے جسے پلک جھپکتے حل نہیں کیا جا سکتا اور یہی وجہ ہے کہ اس کے حل کے لئے کوششیں ابھی سے شروع کرنا ضروری ہیں۔ فی الحال تمام کوششیں موسمیاتی تبدیلی کے اثرات سے بچنے اور ان اثرات کے پیش نظر اپنے رہن سہن میں تبدیلی پر مرکوز ہونی چاہئیں کیونکہ یہی ایک ایسا اقدام ہے جسے ہم فوری طور پر اٹھا سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے شہروں اور دیہاتوں کی تعمیر و ترقی کے تمام تر منصوبوں کو موسمیاتی تبدیلی کے اثرات کے پیش نظر رکھتے ہوئے بنانا ہوگا تاکہ مستقبل میں ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات سے بچا جا سکے۔

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام مینیجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

۱۔ توہین عدالت کے بل تو اسمبلیوں میں پیش ہوتے ہی منظور ہو جاتے ہیں۔ لیکن توہین انسانیت کا کیا؟ نہ کوئی توہین انسانیت پر نوٹس لیتا ہے اور نہ انسانیت کی حرمت قائم رکھنے کے لیے پیش ہونے والے بلوں کی کوئی اہمیت ہے۔

۲۔ جمہوری ملک میں جمہور کے پاس اختیارات ہوتے ہیں! لیکن پاکستان میں جمہور کون ہے؟ اس اصطلاح کی بھی تشریح کرنے کی ضرورت ہے۔

۳۔ نہ جانے پارکوں، سڑکوں، دریاؤں اور سمندروں کے کنارے ہمارے لیڈر اتنا گند کیوں ڈال دیتے ہیں؟ بھگتنا عوام کو پڑتا ہے جو بچاری کبھی ان جگہوں پر جاتی ہی نہیں ہے۔

۴۔ فوج کا عمل دخل کسی طور بھی جمہوری ریاست میں برداشت نہیں کریں گے۔ ہاں لیکن پولیو کے قطرے پلوانے میں برداشت کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ میڈیا تو عوام کے کان اور آنکھیں ہیں۔ لیکن وہ ایسا ربوٹ ہے جو نہ اپنی مرضی سے سن سکتا ہے اور نہ دیکھ سکتا ہے۔

۶۔ کیا تیسری صنف والے شہریوں کی فہرست میں نہیں آتے؟ یا کہیں پاکستان کے دستور میں خبردار کے ساتھ تحریر ہے کہ یہ دستور صرف خواتین و حضرات کے لیے ہے۔

۷۔ ہم وہ قوم ہیں جو اعداد و شمار اکھٹے کیئے بغیر صدیوں کی منصوبہ بندی کر لیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان منصوبہ بندیوں پر عمل نہیں ہو سکتا۔

۸۔ ہمیں این جی اوز کی ضرورت نہیں ہے۔ یہودی ایجنڈا اور ان کا پیسہ ہمیں نہیں چاہیئے۔

۹۔ بھکاری کے طور پر ہمارے لیڈر ہی کافی ہیں۔ ایک بھکاری اپنے علاقے میں دوسرے بھکاری کو برداشت نہیں کرتا۔

۱۰۔ ہم شدت پسند تب تک نہیں ہوتے جب تک ہمارے ساتھ ظلم نہ ہو۔ ورنہ ظلم ہوتے دیکھنا تو اب ہمارا مشغلہ بن چکا ہے۔

۱۱۔ ہتھیار اٹھانے سے پہلے اگر آواز اٹھالی جاتی یا سوال اٹھا لیا جاتا تو شاید ہتھیار اٹھانے کی نوبت نہ آتی۔

# ڈی ایس این جی کا تحفظ

حور کاکڑ

آپ سب کو یاد ہوگا کہ حال ہی میں ایک سیاستدان کی اشتعال انگیز تقریر نے سننے والے ہجوم کو میڈیا ادارے کے دفتر پر حملہ کرنے کے لئے اکسایا تھا۔ خیر یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میڈیا جتنا آزاد نظر آتا ہے اتنا خطرے کا شکار بھی رہتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جو فیلڈ اور ڈیسک دونوں جگہ یکساں موجود ہے۔ اگست ۲۰۱۶ء میں اے آر وائے کے دفاتر پر متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) کے کارکنوں کا حملہ ایک ناگزیر واقع نہیں تھا۔ ایسے واقعات سیاسی بدامنی کے دوران معمول بنتے جا رہے ہیں خصوصاً جب میڈیا کے اداروں پر متعصب رائے دینے کا الزام ہو۔ یہ حملہ صرف دفتر کی توڑ پھوڑ تک محدود نہیں تھا اس میں پانچ سے زائد ہلاکتیں بھی ہوئی تھیں۔ البتہ اس واقعے سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اس میڈیا کے ادارے میں مناسب سیکیورٹی پالیسی موجود نہیں ہے۔

کمیٹی ٹو پروٹیکٹ جرنلسٹ کی جانب سے شائع کی جانے والی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۲ء سے اب تک دنیا بھر میں تقریباً ۱۲۰۸ صحافی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ یقیناً کچھ لوگ یہ کہیں گے کہ اس تعداد کو بڑھا چڑھا کے پیش کیا گیا ہے۔ البتہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے فیلڈ میں صرف رپورٹر ہی نہیں بلکہ ایک پوری ٹیم موجود ہوتی ہے۔ رپورٹر پر حملے کو میڈیا پر حملہ تصور کیا جاتا ہے، لیکن کیمرہ مین، تکنیکی اسٹاف، انجینئرز، ڈرائیور، ڈی ایس این جی وین (ڈیجیٹل سیٹلائیٹ نیوز گیدرنگ وین) کا کیا؟

ٹیکنیکل ٹیم کو فیلڈ اور دفتر دونوں جگہ ایک جیسے خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تنازعاتی علاقوں میں کام کرنے والی میڈیا ٹیم کو اس لئے بھی خطرات سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ میڈیا کے ادارے اپنے سٹاف کی حفاظت کے انتظامات نہیں کرتے۔ اوپر بیان کیے گئے واقعے میں صرف میڈیا کے ادارے کے دفتر پر حملہ نہیں کیا گیا تھا، بلکہ ایم کیو ایم کے کارکنوں نے سماء ٹی وی چینل کی ڈی ایس این جی وہیکل پر بھی حملہ کیا۔ اسٹیشن سے سامان تک گویا میڈیا سے منسلک ہر چیز خطرے سے دوچار رہتی ہے۔

ایسا واقع پہلی بار پیش نہیں آیا بلکہ ۲۰۱۵ء میں دو الگ واقعات میں جیو نیوز اور ڈان نیوز کی ڈی ایس این جی وہیکلز پر حملے کیے گئے۔ اس حملے میں صرف سامان ہی کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ ہلاکتیں بھی ہوئیں تھیں۔ ان واقعات کا بار بار پیش آنا ان پالیسیوں میں پائے جانے والے خلاء کی عکاسی کرتا ہے جو ادارے اپنی اور اپنے سٹاف کی حفاظت کی خاطر بناتے ہیں۔ پالیسیوں کا اثر میڈیا ٹیموں، پریس کلب اور میڈیا کے اداروں سب پر یکساں ہوتا ہے۔ یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ میڈیا کے اداروں نے اپنی ٹیموں کی حفاظت کے لیے ضابطہ اخلاق بنانے پر کبھی توجہ نہیں دی۔

کیمرہ مین، فوٹو گرافرز اور ڈی ایس این جی گاڑیاں بھی خطرے سے دوچار رہتی ہیں۔ اگست، ۲۰۱۶ء کے دوران کوئٹہ میں ہونے والے حملے میں ڈان نیوز کے ایک کیمرہ مین شہید ہوئے۔ جب بھی میڈیا کارکنان کی حفاظت پر بات ہوتی ہے تو تکنیکی اسٹاف کی حفاظت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس غفلت کی وجہ سے وہ ہمیشہ خطرات سے دوچار رہتے ہیں۔ یقیناً بعض اوقات حملے ناگزیر ہوتے ہیں لیکن فیلڈ اسٹاف کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے سے ایسے نقصانات سے بچا جا سکتا ہے۔ تکنیکی اسٹاف کی بات کی جائے تو محض حفاظتی پالیسی کی کمی واحد وجہ نہیں بلکہ کم تنخوائیں بھی ایک بڑی وجہ ہیں جس کی بدولت اسٹاف مشکلات سے دوچار رہتا ہے۔

فیلڈ میں میڈیا کارکنان کو لاحق خطرات سے نمٹنے کے لیے سٹینڈرڈ آپریٹنگ پروسیجرز بنانے کی اشد ضرورت ہے۔ ممکنہ خطرات کی نشاندہی سے لے کر ان کے خاتمے کے لیے حل تلاش کرنا کافی نہیں ہے۔ ان واقعات سے سیکھنا اور سیکورٹی پالیسیاں پر عمل کرنا اور موجودہ پالیسیوں میں پائی جانے والی کمزوریوں کو دور کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کرنے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ فیلڈ اور تکنیکی اسٹاف کو جو سب سے پہلا خطرہ رپورٹر کی متعصب رپورٹنگ کی وجہ سے لاحق ہوتا ہے۔ چنانچہ رپورٹر کو اپنے الفاظ کی وجہ سے اپنی ٹیم کو لاحق خطرات سے پوری طرح آگاہ ہونا چاہیئے۔ جتنا رپورٹر اپنی رپورٹنگ میں غیر جانبدار ہوگا اتنا ہی تکنیکی ٹیم کو کم خطرات لاحق ہوں گے۔ چونکہ تکنیکی ٹیم کو کم تنخواہ دی جاتی ہے اس لیے انہیں کام کرنے کیلئے حوصلہ افزائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کو انشورنس کے ساتھ ساتھ تنخواہوں میں بونس بھی دینا چاہیئے

تا کہ وہ تنازعاتی علاقوں میں کام کرنے کے لئے تیار رہیں۔

فیلڈ ٹیم کو کسی بھی خطرے سے نمٹنے کے لیے سول ڈیفینس کی تربیت بھی دی جانی چاہیے۔اس کے علاوہ ڈی ایس این جی وہیکل میں موجود انجینئر کو فیلڈ پر ایمرجنسی میں فیصلہ کرنے کی پوری اجازت ہونی چاہیئے ۔ڈی ایس این جی میں ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے حفاظتی ساز وسامان اور اردگرد کے ماحول پر نظر رکھنے کے لیے مانیٹرنگ سسٹم بھی موجود ہونا چاہیئے ۔ڈی ایس این جی وہیکلز پر ان کے میڈیا کے اداروں کے لوگوز یا علامات موجود ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ان کو زیادہ خطرہ لاگو رہتا ہے۔پالیسی میں یہ واضح کر دینا چاہیئے کے ڈی ایس این جی وین پر برانڈنگ نہیں کی جانی چاہیئے کیونکہ ان کو ایسے ہجوم سے خطرہ لاحق ہوسکتا ہے جو کسی مخصوص میڈیا کے ادارے کے بارے میں متعصّبانہ رائے رکھتے ہیں۔ہر میڈیا کے ادارے کے پاس کم از کم تین ڈی ایس این جی وہیکلز ہوتی ہیں،اس لئے یہ میڈیا کے ادارے اپنے سامان اور ٹیم کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے ان ڈی ایس این جی وہیکلز کو بلٹ پروف بنانے پر بھی غور کر سکتے ہیں۔

یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ میڈیا کے ادارے سب سے پہلے خبر نشر کرنے اور ریٹنگ بڑھانے کے چکر میں ڈی ایس این جی وہیکلز کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ڈی ایس این جی وینز کا غلط استعمال نہ ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ ان سے رپورٹ ہونے والی خبر کا ایک خاص معیار بنا دیا جائے۔ڈی ایس این جی وینز سے مخصوص خبروں کی رپورٹنگ کو پالیسی کا حصہ بنا دینا چاہیئے۔صحافت ایک خطرناک پیشہ ہے،لیکن پھر بھی ہمارے ہاں ایسے صحافیوں کی کمی نہیں جو پُرخطر موضوعات پر کام کرنے کو تیار رہتے ہیں۔میڈیا اداروں کی جانب سے فیلڈ رپورٹنگ کے لیے بنائی گئی حفاظتی اور سیکورٹی پالیسی میں رپورٹر اور ٹیکنیکل اسٹاف کو بھی شامل کیا جانا چاہیئے۔کیونکہ فیلڈ سٹاف کا تحفظ ہی میڈیا کے اداروں کا تحفظ ہے۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی
حیثیت سے کام کر رہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

# رپورٹنگ اور ریٹنگ کی دوڑ

تحریر: ریحان علی

ہم اپنے ہدف سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔
ہم جان تو دے سکتے ہیں لیکن اپنے مقاصد حاصل کیئے بنا کبھی نہیں پلٹ سکتے۔
ہتھیار ڈالنا ہمارا شیوا نہیں ہے۔
ہمیں شہادت کے رتبے پر فائز ہونا ہے۔

یقیناً یہ وہ جملے ہیں جو کہ کسی خاص شعبے سے منصوب کیئے جاتے ہیں اور اسی شعبہ کو زیب دیتا ہے کہ وہ شہادت کے جذبے سے سرشعار ہوں۔لیکن اگر یہ الفاظ آپ کسی صحافی یا میڈیا سے وابستہ افراد سے سنیں تو یقیناً آپ کو بھی حیرت ہوگی۔ایسے خیالات رکھنے والے میڈیا کے نمائندگان سے گزارش ہے کہ اگر آپ کو شہید ہونا ہے تو اس کے لیے آپ کو فوج میں جانا چاہیئے صحافت کا پیشہ شہادت کے لیے نہیں اپنایا جاتا۔ہاں یہ ضرور ہے کہ اس شعبے کو درپیش مسائل اتنے سنگین ہیں کہ کوئی بھی میڈیا کا نمائندہ دورانِ ڈیوٹی شہید ہوسکتا ہے لیکن پاکستان میں دہشتگردی کے مسائل کو دیکھا جائے تو سیکیورٹی کے مسائل تو وکلاء، ڈاکٹرز، اساتذہ، شاگرد وغیرہ سب ھی کے لیے یکساں ہیں۔ملک میں امن وامان کی صورتحال ایسی ہے کہ ہر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم تو سر پر کفن باندھ کر گھر سے نکلتے ہیں کبھی بھی کہیں بھی کوئی بھی سانحہ پیش آ سکتا ہے۔

صحافیوں کو درپیش مسائل پر بات کی جائے تو اتنے مسائل ہیں کہ یوں محسوس ہوگا کہ ان کا حل ممکن ہی نہیں،لیکن ایسا نہیں ہے بے شمار باران کے مسائل کے حل کے لیے بات کی گئی اور اقدامات بھی اٹھائے گئے۔ان اقدامات اٹھانے والوں میں میڈیا کے ادارے، پریس کلب صحافتی تنظیمیں اور غیر سرکاری اور سرکاری ادارے شامل ہیں۔لیکن پھر بھی بہت سی کمیاں موجود ہیں جن کو بھرپور طریقے سے پورا کرنے کی اشد ضرورت ہے،جن میں دیرپا اور مستقل بنیادوں پر اقدامات کرنا نہایت اہم ہے۔مزید یہ کہ اقدامات کیا ہوں گے وہ میڈیا کے نمائندگان بہتر جانتے ہیں۔لیکن مسائل کے حل ایسے نہیں ہونے چاہیئں جو کہ ایک تربیتی ورکشاپ میں چند صحافیوں سے بات کرتے ہوئے بار بار سامنے آرہے تھے۔اپنے مسائل کے حل کے حوالے سے بات کرتے ہوئے صحافیوں کا کہنا تھا کہ میڈیا مالکان کے دل میں خدا کا خوف ڈلوانے کے ضرورت ہے یہ ہی ایک قدم ہے جس کی بدولت صحافیوں کے لیے آسانی پیدا ہوسکتی ہے۔میرے خیال میں خدا کا خوف دل میں ڈلوانا حل نہیں ہے۔

حال ہی میں پیش آنے والے کوئٹہ ۸ اگست ۲۰۱۶ء کے سانحے کا ذکر کریں تو اس میں نوے سے زیادہ شہید ہونے والوں میں دو نجی ٹیلی ویژن کے دو کیمرہ مین بھی شہید ہوئے ہیں۔

وہ کیمرہ مین یا صحافی جو دورانِ ڈیوٹی شہید ہو چکے ہیں ہم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے لیکن ان کے اداروں کو شہید صحافیوں کے خاندان کی کفالت کے لیے کوئی پالیسیاں مرتب کرنی چاہیئں۔یقیناً میری اس بات سے صحافیوں کو یہ ہی اختلاف ہوگا کہ زندہ اور ڈیوٹی پر موجود لوگوں کو تو تنخواہ نہیں ملتی تو اس سلسلے میں کیا قدامات ہو سکتے ہیں۔ایک نہایت لازمی بات یہ بھی ہے کہ ہم یقیناً شہیدوں کو واپس تو نہیں لا سکتے لیکن اپنے صحافیوں اور کیمرہ مینوں کی تربیت میں اور ان کو دی جانے والی ہدایات میں یہ ضروری قرار دیا جا سکتا ہے کہ کیمرہ مین ہائی ریزولوشن کیمرہ کا بھرپور استعمال کرے اور اپنی جان کو قیمتی جانتے ہوئے خطرے والی جگہ کے قریب نہ جائے۔پاکستان میں ہی ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جہاں چند ایک اقدامات کیئے جا رہے ہیں جیسے کہ ایکسپریس گروپ نے صحافیوں کی انشورنس کروائی ہے جس پر دیگر اداروں کو عمل درآمد کرنے کی ضرورت ہے لیکن یہ لائف انشورنس ہے اگر کوئی صحافی کسی اسائنمنٹ پر کام کرتے ہوئے زخمی ہو جاتا ہے تو اداروں کو چاہیئے کہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے بھی کوئی مناسب اقدامات اٹھائیں۔

اخلاقیات کی بات کی جائے تو میڈیا کے لیے پیمرا نے کچھ قواعد وضوابط بنائے ہیں اگر ان ہی قواعد پر عمل کرلیا جائے تو یہ بات یقینی ہے کہ میڈیا میں کام کرنے والے افراد بہت سے مسائل اور مشکلات سے بچ سکتے ہیں۔ اگر کوئٹہ کے سانحے کی ہی بات کریں تو اس سانحے کے فوراً بعد منظر عام پر آنے والی ویڈیوز میں خون میں لت پت لاشیں دیکھ کر یہ بات عیاں ہوگئی تھی کہ نہ تو میڈیا والوں کو ان لاشوں کی حرمت کی پرواہ ہے اور نہ ہی اپنی جان کی پرواہ ہے۔ جنگ زدہ اور متنازعہ علاقے سے رپورٹنگ کرنے والوں کے لیے چند قوانین ہیں جن پر عمل پیرا ہونا بہر حال ضروری ہے۔ صحافت کے قوانین کو مدِ نظر رکھتے ہوئے رپورٹنگ ہوسکتی ہے اور اس کی مثالیں ہمارے میڈیا کے وہ نمائندگان دیتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک صحافی سے ایک ورکشاپ کے دوران بات ہوئی تو ان کا کہنا تھا کہ اک دفعہ انہیں ایک خبر ملی جس کے بارے میں باقاعدہ تحقیق کی ضرورت تھی۔ انہوں نے یہ کہہ کر اس خبر پر رپورٹ بنانے سے انکار کر دیا کہ اس کے بہت سے پہلو ہو سکتے ہیں جب تک تحقیق مکمل نہیں ہو جاتی ہم اس پر کوئی رپورٹ کسی کے سامنے نہیں لا سکے۔ اس کی بات مانتے ہوئے ادارے نے فیصلہ کیا کہ وہ تمام پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہی رپورٹ شائع کریں گے۔ میرے خیال میں ہمارے میڈیا کے نمائندگان کو اپنے پیشے کی اخلاقیات سے آگاہی ہونی چاہئے اور اس پر عمل کرنا چاہئے جو کہ ان کے لیے مشکل کام نہیں ہے کیونکہ ان ہی کے کچھ ساتھی اخلاقیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ذمہ داری سے کام کر رہے ہیں یہ ہی وجہ ہے کہ ان کے لیے اس پیشے میں خطرات کم ہو جاتے ہیں۔ اگر خطرات کو کم کرنا ہے تو اس کے لیے ذمہ داری کے ساتھ صحافتی پیشے کو نبھانا ہوگا۔

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام مینیجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

# میڈیا اور صنفی دقیانوسی تصورات

تحریر: ماریہ افتخار

میڈیا ایک انتہائی با اثر پلیٹ فارم ہے جس کے معاشرے پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ معاشرتی اقدار کی تعمیر و تشکیل میں میڈیا کا کردار نہایت اہم ہے اسی لئے ضروری ہے کہ اسے اپنی ذمہ داری کا احساس ہو اور رپورٹنگ کے دوران میڈیا کو صنفی حساسیت کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ یوں تو میڈیا پورے معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن بچوں پر اسکے اثرات خصوصی طور پر توجہ طلب ہوتے ہیں کیونکہ وہ میڈیا کے ذریعے نشر ہونے والے پیغامات کے اثرات کو سمجھ نہیں پاتے۔ مثلاً چھوٹے بچے جب کارٹون یا دوسرے پروگراموں میں جارحانہ رویے دیکھتے ہیں تو ہمیشہ یہ خدشہ رہتا ہے کہ وہ بڑے ہو کر اپنی زندگی میں بھی جارحانہ رویہ اپنائیں گے۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں جو زبان استعمال ہوتی ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا میڈیا صنفی حساسیت کو مدِ نظر نہیں رکھتا۔

ہمارا میڈیا صنفی لحاظ سے دقیانوسی تصورات کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ خواتین کو ٹی وی ڈراموں اور خبروں میں گھر کے کام کرتے ہوئے یا زیادتی اور تشدد کا شکار ہوتے دیکھایا جاتا ہے۔ عورت کے ساتھ زیادتی پر رپورٹنگ کرتے ہوئے میڈیا زیادتی، عزت لٹنے اور عصمت دری جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ یہ الفاظ ہمارے معاشرے میں موجود دقیانوسی تصورات کی عکاسی کرتے ہیں۔ 'عاشی: آدمیوں کی دنیا میں ایک مخنث کی جدوجہد' جیسے نیوز ٹائٹل سے پتہ چلتا ہے کہ معاشرے اور میڈیا میں صنفی حوالے سے دقیانوسی تصورات ابھی بھی پائے جاتے ہیں۔

میڈیا کی صنفی دقیانوسیت کی وجہ سے کچھ شعبوں میں خواتین کی تعداد کافی کم ہوتی جارہی ہے۔ خواتین کی سماجی طور پر با اختیار بنانے کے حوالے سے میڈیا کوئی خاص کردار ادا نہیں کر رہا۔ ایک مخنث کو ٹی وی پر یا تو رقص کرتے ہوئے دیکھایا جاتا ہے یا پھر مانگتے ہوئے۔ خبروں میں انہیں ہمیشہ ہراساں ہوتے یا تشدد کا شکار ہوتے ہوئے دیکھایا جاتا ہے اور ہمیشہ کمزور پیش کیا جاتا ہے۔ مخنث پر تشدد کی خبریں تو ٹی وی پر دیکھائی جاتی ہیں لیکن ان کو اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہیں دیکھایا جاتا۔ مخنث اب سماجی رکاوٹیں توڑ رہے ہیں اور ملازمت بھی کر رہے ہیں۔ صنم فقیر نے ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں حصہ لیا۔ رفی خان نے شکارپور کی شاہ عبدل یونیورسٹی سے معاشیات اور پولیٹکل سائنس میں ڈبل ایم اے کیا ہوا ہے اور وہ محکمہ سماجی بہبود میں کام کرتی ہے۔ آرزو ٹرانس ایکشن خیبر پختونخواہ میں جنرل سیکرٹری ہے۔ پانچ سال پہلے اس نے پشاور میونسپل کارپوریشن کے دفتر میں ایک نائب قاصد کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔ حالانکہ اس دوران ان پر ایک دو دفعہ حملے بھی ہوئے لیکن پھر بھی وہ ایک اچھی پیشہ ورانہ زندگی گزار رہی ہیں۔ رمشا کلفٹن کینٹونمنٹ بورڈ میں کام کرتی ہیں اور بندیا رانا جنڈر انٹرایکٹو الائنس کی بانی ہیں، یہ ادارہ مخنث افراد کے حقوق کے لیے کام کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کپڑے بنانے کا ایک چھوٹا سا کاروبار بھی کرتی ہیں۔ الماس بھی اپنی این جی او چلا رہی ہے۔ پاکستان میں ۵۰۰،۰۰۰ سے زیادہ افراد تیسرے جنس سے تعلق رکھتے ہیں جس میں کراس ڈریسرز، مخنث، ہرمافروڈائٹس، ٹرانس وسٹائٹس اور خواجہ سرا شامل ہیں۔ وقت کے ساتھ ان کی تعداد میں اضافے کا امکان ہے کیونکہ یہ آبادی کا اہم حصہ ہیں اور ملک کی ہیومن ریسورس کا اہم حصہ ہیں۔ خواجہ سراؤں کے بارے میں ہمارے رویے انگریزوں کے دور حکومت کے میں تبدیل ہوئے جب خواجہ سراؤں کو ٹرائبل ایکٹ ۱۸۷۱ کے تحت مجرموں کی صف میں کھڑا کر دیا گیا۔ حالانکہ برصغیر کی تاریخ میں خواجہ سراؤں کی ہمیشہ عزت کی جاتی رہی ہے۔ انگریزوں کے دور سے پہلے ان کو مشیر بنایا جاتا تھا۔

ان کی ایمانداری کی وجہ سے ان کو خواتین کے محلات کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری سونپی جاتی تھی۔ خواجہ سرا اپنی ایمانداری کی وجہ سے مشہور تھے اور خواتین ان کے ساتھ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتی تھیں۔ خواجہ سراؤں کی معاشرے میں بے حد خدمات انجام دینے پر لودھیوں کی حکومت میں ان کے لیے 'حجڑوں کی خانقاہ' کے نام سے ایک یادگار تعمیر کی گئی تھی۔ آج کے دور سے موازنہ کیا جائے تو پچھلے ادوار میں خواجہ سراؤں کی معاشرے میں بہت عزت تھی اور یہ امیر لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ ریاست کے فیصلوں

میں ان کا اثر کافی ہوتا تھا۔میڈیا پر خواجہ سراؤں کے منفی پہلوؤں کو زیادہ دیکھایا جاتا ہے۔خواتین سماجی رکاوٹیں توڑتے ہوئے اب فوج میں جارہی ہیں اور کھیل میں بھی حصہ لے رہی ہیں اور مرد فیشن انڈسٹری میں جارہے ہیں اور شیف بھی بن رہے ہیں۔میڈیا کی طرف سے صنف پر منفی تصورات پیش کرنے سے معاشرے پر بھی اثر پڑتا ہے ۔صنف کی منفی تصویر کشی کرنے سے

خواتین اور خواجہ سراؤں کو بااختیار بنانے میں مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں۔میڈیا کے اس منفی کردار کا ہم پر بہت اثر پڑا ہے جس کے نتیجے میں تمام صنفوں کو ایک خاص طریقے کا برتاؤ رکھنے پر مجبور کردیا گیا ہے۔میڈیا کی طرف سے پیش کیے گئے صنفی دقیانوسی تصورات کا معاشرے پر شدید اثر پڑتا ہے۔میڈیا معاشرے میں مرد،عورت اور خواجہ سراؤں کے بارے میں پائی گئی سوچ کو تبدیل کرسکتا ہے اور معاشرے میں سب کے ساتھ مساوی سلوک کرنے میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی
حیثیت سے کام کررہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

# بھگت سنگھ کون تھا؟

تحریر: ریحان علی

بھگت سنگھ ایک فریڈم فائٹر اور سیاسی کارکن تھے جنھوں نے ۱۹۰۷ء۔۱۹۳۱ء کے دور کی اقدار کو چیلنج کیا اور اپنی راہ خود بنائی۔ ان کے آباواجداد کا تعلق پاکستان سے تھا خاص طور پر لاہور اور فیصل آباد، لیکن اس بارے میں بہت کم لوگوں کو علم ہے۔ لیکن اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کو پاکستان میں بے شمار ایسے لوگ جانتے ہیں جو پہلے نہیں جانتے تھے۔ اس کو ممکن بنانے میں حفیظ چاچڑ کا نہایت اہم کردار ہے۔ حفیظ چاچڑ ایک صحافی اور دستاویزی فلم ساز ہیں جنھوں نے بھگت سنگھ کی زندگی پر ایک دستاویزی فلم اور تھیٹر بنایا ہے۔ "مجھے بھگت سنگھ کے بارے میں معلوم نہیں تھا لیکن جب میں دہلی گیا وہاں میں نے بھگت سنگھ کی زندگی اور کردار پر ایک پروگرام میں شرکت کی، جس کے بعد میں نے ان کی زندگی اور کردار پر ایک دستاویزی فلم اور تھیٹر بنانے کا فیصلہ کیا۔ وہ ۲۳ سال کی عمر میں شہید ہوئے میں اس نوجوان سے بہت متاثر ہوا اور چاہتا ہوں کے لوگوں کو بھی بھگت سنگھ کی زندگی کے بارے میں پتا چلے۔ بہت سے لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ان کا تعلق پاکستان سے تھا۔ وہ لائل پور میں پیدا ہوئے جواب فیصل آباد کے نام سے جانا جاتا ہے اور لاہور میں شہید ہوئے"۔ حفیظ چاچڑ نے اس عنوان پر دستاویزی فلم بنانے کی وجہ بیان کرتے ہوئے بتایا۔

حفیظ چاچڑ نے مزید کہا کہ "دستاویزی فلم بنانے کا مقصد یہ بھی تھا کہ پاکستان میں بھگت سنگھ کے بارے میں پائی جانے والی رائے کو تبدیل کیا جائے۔ بھگت سنگھ کی کوششوں اور ان کی زندگی کے بارے میں شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے انہوں نے آزادی کے لیے جدوجہد کی تھی ہمیں مذاہب سے بالاتر ہو کر اپنے ہیروز اور ان کی جدوجہد کو تسلیم کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں غیر مسلم ہیروز کا احترام اور ان کی کوششوں کو سراہنے کی ضرورت ہے۔ ہماری تاریخ اور نصاب میں غیر مسلم ہیروز کی کامیابیوں پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی اور ہمارے نوجوان نسل کو درست معلومات بھی فراہم نہیں کی جاتیں"۔ جس چوک پر بھگت سنگھ کو لاہور میں پھانسی دی گئی تھی اس کا نام شادمان چوک ہے۔ سول سوسائٹی کے نمائندوں، مورخین اور تعلیمی ماہرین نے شادمان چوک کو بھگت سنگھ چوک کے نام سے منصوب کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ اس سلسلے میں حکومت نے ان کے حق میں نوٹیفیکیشن بھی جاری کر دیا لیکن شادمان ٹریڈرز ایسوسی ایشن نے اس کی مخالفت کی اور اب یہ مسئلہ عدالت میں زیر بحث ہے۔

بھگت سنگھ کون تھا؟ بھگت سنگھ ۱۹۰۷ء میں بھنگا تحصیل لائل پور میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد کشن سنگھ جیل میں تھے۔ ان کے چچا سردار اجیت سنگھ ایک بہترین فریڈم فائٹر تھے جنھوں نے انڈین پیٹری آرٹس ایسوسی ایشن قائم کی جس نے کسانوں کو چناب کینال کالونی بل کے خلاف متحرک کیا۔ بھگت سنگھ نے بہت ہی کم عمر سے مہاتما گاندھی کی نان کاپوریشن موومنٹ میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ بھگت سنگھ نے حکومت کی جاری کردہ کتابوں کو جلایا اور مہتما گاندھی کی خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے انگریزوں کی غلامی قبول کرنے سے کھلم کھلا مخالفت کی۔ گاندھی نے چوراچوری جیسے پرتشدد واقعات کے نتیجے میں اپنی نان کاپوریشن موومنٹ کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ بھگت سنگھ کو اس فیصلے پر بہت مایوسی ہوئی اور انھوں نے گاندھی کی غیر متشدد موومنٹ سے علیحدگی اختیار کر لی اور نوجوان انقلابی تحریک میں شامل ہو گئے۔ بھگت سنگھ نے بعد میں ہندوستان ریپبلکن ایسوسی ایشن میں شمولیت اختیار کی جو ایک بنیاد پرست گروپ کی جانب سے جانا جاتا تھا اور جس کا نام بعد میں تبدیل ہو کے ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن ہو گیا تھا۔ مارچ ۱۹۲۶ء میں نوجوان بھارت سبھا کی بنیاد رکھی گئی اور بھگت سنگھ کو اس کا سیکرٹری مقرر کیا گیا۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو لالہ لاجپت رائے کی زیرِ قیادت میں تمام جماعتوں نے سائمن کمیشن کے خلاف لاہور ریلوے اسٹیشن کی طرف جلوس کی شکل میں مارچ کیا۔ جلوس کو روکنے کے لیے پولیس نے سرگرم کارکنوں پر لاٹھی چارج کیا۔ اس محاذ آرائی کے نتیجے میں لالہ لاجپت رائے بری طرح زخمی ہوئے اور ان کا انتقال ہو گیا۔ لالہ لاجپت رائے کی موت کا بدلہ لینے کے لیے بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے اسکاٹ جو سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا اس کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس نے لاٹھی چارج کا حکم دیا تھا۔ انقلابیوں نے جے پی سانڈرز جو اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تھا اس کو غلطی سے اسکاٹ سمجھ کر قتل کر دیا۔ بھگت سنگھ گرفتاری سے بچنے کے لیے لاہور سے فرار ہو گئے اور انھوں نے اپنی داڑھی اور بال بھی کٹوا دیے تا کہ ان کو کوئی پہچان نہ سکے۔

جے پی سانڈرز کے قتل میں جو لوگ ملوث تھے ان کے بارے میں تمام معلومات برطانوی حکومت کو مل گئی۔ بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو پر قتل کا الزام عائد کیا گیا۔ بھگت

سنگھ نے قتل کرنے کا اعتراف کرلیا اور مقدمے کی سماعت کے دوران برطانوی حکومت کے خلاف بیانات دیے۔ جیل میں بھگت سنگھ کو معلوم ہوا کہ قیدیوں کی طرف حکومت نے دوغلی پالیسی اپنائی ہوئی ہے۔ بھارتی سیاسی قیدیوں کے مقابلے میں غیر ملکی مجرموں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جا رہا تھا۔ احتجاج کے طور پر بھگت سنگھ نے دوسرے قیدیوں کے ساتھ مل کر بھوک ہڑتال کا اعلان کیا۔ یہ ہڑتال مہینے سے زیادہ چلی اور آخر میں برطانوی حکومت کو جیل کے حالات بہتر کرنے پڑے۔ بھگت سنگھ کو سزائے موت سنا دی گئی۔ پھانسی پر چڑھنے سے پہلے انھوں نے برطانوی سامراج کے خلاف نعرہ بلند کیا۔ ان کے جسم کو پولیس نے حسینی والا میں جلا دیا اور ان کی باقیات کو دریائے ستلج میں پھینک دیا۔ اگلے دن ان کے ساتھیوں نے ان کے جسم کی باقیات کو جمع کر کے لاہور میں ایک جلوس نکالا۔ مجھے امید ہے کہ اس دستاویزی فلم کے بارے میں یہ معلومات اور آپ بھی اس فلم کو دیکھنا چاہیں گے۔

دستاویزی فلم کے علاوہ حفیظ چاچڑ نے ایک تھیٹر بھی بنایا ہے جس میں یہ تصوراتی کہانی بھگت سنگھ کے پاکستان کے ایک دن کے دورے کے بارے میں ہے (کہ اگر بھگت سنگھ زندہ ہوتے اور پاکستان آ کر لوگوں کے حالات دیکھتے تو کیا ہوتا) اس میں وہ اپنے شہر کے لوگوں سے ملاقات کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ ایک آزاد ملک میں کس طرح اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ تھیٹر نوجوانوں کے خیالات تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ بھگت سنگھ کے کردار کی ہمارے میڈیا، تاریخ اور تعلیمی نصاب میں صحیح عکاسی نہیں کی گئی۔ ہمارے ہیروز جن کا تعلق دوسرے مذاہب سے ہے ان کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی اور ہماری نوجوان نسل ان ہیروز کی قربانیوں سے واقف نہیں ہو پاتے۔

پاکستان کی ریاست نے پاکستان کی نوجوان نسل کو جانتے بوجھتے غیر مسلم ہیروز جیسے بھگت سنگھ اور سرگنگا رام وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم نہیں کیں۔ ہمیں لوگوں میں تعلیم، فلم اور آرٹ کے ذریعے مذہبی ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے جس کا نوجوان نسل کو بہت فائدہ ہوگا۔ بھگت سنگھ ایک سکھ تھا لیکن وہ برطانیہ سے آزادی لینے کے لیے پرعزم تھا۔ یہ ضروری ہے کہ ہم ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے ہیروز کو اہمیت دیں چاہے وہ سکھ، عیسائی یا ہندو ہوں۔ ہمیں ان ہیروز کو مسلمان ہیروز والا درجہ دینا چاہیئے۔ ہمارے مورخین ان ہیروز کو بھول گئے ہیں جن کا تعلق اقلیتوں سے ہے۔ نوجوان نسل کا تاریخ کے بارے میں شعور اجاگر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ ایک بہتر مستقبل کے لیے اپنے ماضی کو سمجھیں۔

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام مینیجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

# قاتل بھی ہو اور غیرت مند بھی؟

## تحریر: فرحان خالد

۱۶ جولائی ۲۰۱۶ء کو پہلی مرتبہ یہ واقعی رونما نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ غیرت کے نام پر کئی قندیلیں بجھتی رہی ہیں۔لیکن یہ ایک قندیل بجھتے بجھتے ایسی راہیں ہموار کر گئی ہے کہ ۱۷ اکتوبر ۲۰۱۶ء کو جلنے والی دو قندیلیں اس کے نام سے منصوب کی جانے لگیں ہیں۔

جی ہاں!

۱۷ اکتوبر کو پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں غیرت کے نام پر قتل اور زنا بالجبر کے واقعات کی روک تھام کے ۲ بلوں کی منظوری دی گئی۔جس کے تحت غیرت کے نام پر قتل کرنے والے کو موت کی سزا پر تو معافی مل سکتی ہے لیکن اس معافی کے باوجود اس کو عمر قید ہوگی جس کی سزا میں کوئی کمی نہیں کی جا سکے گی۔غیرت کے نام پر قتل کے کیسوں میں ہمیشہ یہ ہی ہوتا آیا ہے کہ غیرت کے نام پر قتل کر دینے والے کو یا تو مقتولہ کے خاندان والے معاف کر دیتے ہیں، راضی نامہ ہو جاتا ہے یا پھر قصاص اور دیت کے نام پر آسانی سے بچاؤ ہو جاتا ہے۔لیکن اب اس بل کے تحت غیرت کے نام پر قتل کے مقدمات کو ناقابل تصفیہ قرار دیا گیا ہے۔غیرت کے نام پر قتل کو ناقابل راضی نامہ جرم بنانے کے لیے بل میں کوڈ آف کرمنل پروسیجر (سی آر پی سی) ۱۸۹۸ میں ترامیم کی گئی ہیں۔ اسی حوالے سے ہائی کورٹ کے ایڈووکیٹ سید وجیہہ الحسن کا کہنا تھا کہ "غیرت کے نام پر قتل کے مقدمات اسی لیے کمزور ہوتے ہیں کہ اس میں ورثہ (ولی) کو حق ہوتا ہے کہ وہ ملزم کو معاف کر دے جو کہ یقیناً مقتول/مقتولہ کا بھائی، باپ یا کوئی رشتے دار ہی ہوگا۔بل میں ترمیم کر کے سزا بڑھا دینے کے حوالے سے ان کا کہنا تھا کہ موجودہ بل سے پہلے بھی غیرت کے نام پر قتل کے مقدمات میں قتل کی نوعیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے سزا تجویز کی جاتی تھیں اور اس کو قتل کی نوعیت کے مطابق سزا دی جاتی تھی۔ان کا مزید کہنا تھا کہ ایسے کیس کو اس صورت میں مضبوط بنایا جا سکتا ہے جب مدعی ریاست ہو، مزید یہ کہ گواہ تعلیم یافتہ ہوں اور ان کو قوانین کے بارے میں پوری معلومات ہو۔ہمارا سامنا اکثر اس صورتحال سے ہوتا ہے کہ گواہوں اور تفتیشی افسر کو معلومات نہیں ہوتی جس کی بدولت کیس کمزور ہو جاتا ہے۔عام طور پر تفتیشی افسر کیس کے چالان جمع کروانے کے بعد کورٹ میں حاضر نہیں ہوتے جس کا فائدہ ملزم اور اس کا وکیل اٹھاتے ہیں اور کیس عدم پیروی کی وجہ سے ختم ہو جاتا ہے" ۔

اسی دن منظور ہونے والے دوسرے بل جو کہ زنا بالجبر کے واقعات کی روک تھام کے لیے ہے۔اس بل میں زنا بالجبر کی صورت میں ڈی این اے کی تحقیقات کو لازم قرار دیا گیا جب کہ بل کے مطابق متاثرہ خاتون کی شناخت ظاہر نہیں کی جائے گی۔بل میں یہ بھی کہا گیا کہ ایسے تمام کیسز کا فیصلہ ۹۰ روز میں کیا جائے گا اور ان بلوں کو جلد قانون کا حصہ بنایا جائے گا۔اس بل میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ زنا بالجبر کے واقعات اگر تھانے کی حدود میں ہوں گے تو اس پر مجرم کو دوہری سزا دی جائے گی۔اس بل میں پاکستان پینل کوڈ، قانون شہادت آرڈر اور سی آر پی سی کی متعدد دفعات میں ترامیم کی گئی ہیں تا کہ جنسی زیادتی کے مقدمات کے ملزمان کے تیز ترین ٹرائل کو یقینی بنایا جا سکے۔بات کی جائے ان بلوں پر تحفظات کے حوالے سے تو یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ بل کو آج منظور کر لیا گیا ہے لیکن بعد میں کچھ کمی ہوئی تو اپوزیشن حق رکھتی ہے کہ اسے دوبارہ پارلیمنٹ میں لائے۔یہ دونوں بل گذشتہ ڈھائی سال سے التوا کا شکار تھے اور حکمراں اتحاد میں شامل چند جماعتوں کے تحفظات کی وجہ سے یہ دونوں بل تاخیر کا شکار ہوتے رہے۔اب ان بلوں کو قانون کی شکل بننے کے لیے قومی اسمبلی اور صدارتی منظوری درکار ہوگی اب ضرورت اس امر کی ہے ان پر عمل کیا جائے۔

امیر جماعت اسلامی سینٹر سراج الحق کے مطابق" یہ قانون شریعت کے منافی ہے" ۔اس حوالے سے بات کرتے ہوئے سید وجیہہ الحسن کا کہنا تھا کہ " غیرت کے نام پر قتل کرنا کسی طور بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے۔اسلام کسی شخص کو بھی یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے۔ پاکستان کے قوانین کے بات کی جائے تو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ پاکستان میں کوئی بھی ایسا قانون لاگو نہیں ہے جو کہ اسلامی تعلیمات کی منافی کرتا ہو۔ پاکستان میں قوانین اسلامی تعلیمات کو مدِ نظر رکھ کر بنائے جاتے ہیں۔اس سوال پر کہ بل میں ترامیم کس نوعیت کی ہونی چاہئیں اس حوالے سے انہوں نے دو مسائل کی نشاندہی کی ایک یہ کہ غیرت کے نام پر قتل مقدمات میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ دونوں فریقین عدالت سے باہر معاملات طے کر لیتے ہیں جس میں پولیس کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ ہمارے جیسے ملک میں ایسے کیس زیادہ تر عدالت میں نہیں لائے جاتے بلکہ جرگہ کے ذریعے ان کو حل کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے ان مسائل کے خاتمے کے لیے بل میں ترامیم کی جانی چاہئیں تا کہ ان مسائل کو بھی حل کیا جا سکے" ۔

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام مینیجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

# مظلوم ترین پیشے کے مظلوم ترین شخص کے نام

محترم! جس ایمانداری جرات اور ہمت سے آپ اس پیشے میں اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں اس جذبے کو میرا اسلام ہے۔ میں نے ہمیشہ یہ سنا ہے کہ صحافی عوام کی آواز کی نمائندگی کرتے ہیں بلاشبہ صحافت کا پیشہ ان سے یہ ہی تقاضا کرتا ہے۔ لیکن آپ ہی کے پیشے کے چند افراد کے ساتھ کام کر کے اور ان سے بات کر کے اندازہ ہوا کہ عوام کی آواز کو بلند کرتے ہوئے آپکی اپنی آواز کہیں دب کر رہ گئی ہے زیادہ تر سے تو سننے میں یہ آیا کہ آپکی آواز میڈیا یا مالکان اور ادارے کے ایجنڈے کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ لیکن اگر آپ لوگ مل کر اپنے لیے آواز بلند نہیں کر سکیں گے تو عوام کی آواز کیسے بن پائیں گے؟

مظلوم بنے رہنے سے مسائل کا حل ممکن نہیں ہے۔ اگر متحد ہو کر آواز اٹھائیں گے تو یقیناً آپکے مسائل کے حل کے لیے کام کرنے والے ادارے مسائل کے حل کی کوشش کریں گے۔ ابھی چند ہفتوں پہلے کسی نجی ٹیلی ویژن کے عملے کو نکالنے پر پیمرا نے اپنی پوری زندگی میں پہلی بار نوٹس لیا تھا۔ اگرچہ پاکستانی ذرائع ابلاغ کے اہم نمائندہ ادارے، کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز، آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی، پاکستان براڈ کاسٹنگ ایسوسی ایشن، پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس، پریس کونسل آف پاکستان اور پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی، صحافیوں کے خلاف جرائم کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے ہی موجود ہیں۔ پھر بھی کیا وجہ ہے کہ آپ جیسے پیشے کی آواز اداروں تک نہیں پہنچ پا رہی؟ ایسا پیشہ جس کا قلم ڈھال ہے لیکن اپنی ڈھال نہیں بن سک رہا، جو ظالم کے خلاف تلوار کا کام کر سکتا ہے لیکن خود ظلم کی چکی میں پس رہا ہے، جو لوگوں کی آواز بن سکتا ہے لیکن اپنے حق کے لیے آواز نہیں اٹھا سکتا، جو لوگوں کی تحفظات پر ذمہ دار اداروں سے سوال کرتا ہے لیکن اپنے ادارے سے اپنے تحفظ کے بارے میں سوال نہیں کر سکتا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے احتساب کرنا اس لیے چھوڑ رکھا ہے کہ ہم بھی احتساب سے بچے رہیں؟

لیکن اگر آپ واقعی اپنے مسائل کا حل چاہتے ہیں تو کچھ ذمہ داریوں کو گلے لگائے رکھتے ہوئے آپ خود بھی زنجیروں سے آزاد ہو جائیں، باخدا اس آزادی کی کنجی آپ ہی کے پاس ہے یقین کیجئے اگر یہ کام آپ نہیں کریں گے تو پھر یہ کام کبھی نہیں ہو سکتا۔ اگر مظالم کی چکی میں پستے چلے جائیں گے تو مسئلہ کشمیر کی طرح آپکا مسئلہ بھی پیچیدہ ہوتا چلا جائے گا۔ بہتر ہے کہ ظلم کے خلاف آوازِ حق بلند کی جائے۔

پس ہمیں آپکے قدم بڑھانے کا انتظار رہے گا، قدم بڑھائیں پورا کاروان ہم قدم ساتھ چلے گا!

منجانب

انڈو یجوئل لینڈ

# مسترد کرنے کا حق

تحریر: ماریہ افتخار

پاکستان میں تقریباً سب ہی لوگ مندرجہ بالا میں سے کوئی نہیں (نوٹا۔نن آف دی ابوو) جیسی اصطلاح سے واقف ہیں۔طالب علموں کی واقفیت اس اصطلاح سے کچھ ایسے ہے کہ انہیں اکثر امتحانات میں درست جواب کا انتخاب کرنے والے سوالوں میں مندرجہ بالا میں سے کوئی نہیں والی آپشن بھی دی جاتی ہے۔اگر سوال کے لیے دیے گئے ممکنہ جوابات میں سے کوئی بھی انتخاب درست نہ ہو تو طالب علم عام طور پر اس کا انتخاب کرتے ہیں۔لیکن امتحانات میں سوال و جواب کے انتخابات کے علاوہ بھی اس اصطلاح کو استعمال کیا جاتا ہے۔یہ ہی انتخاب جمہوری ممالک میں عوام کے پاس ہوتا ہے کہ وہ ووٹ دیتے وقت اپنے بیلٹ پیپر پر امیدواران کا انتخاب کرنے کے علاوہ یہ رائے بھی دے سکیں کہ مندرجہ بالا میں سے کسی بھی نمائندے کو ووٹ نہیں دینا چاہتے۔یہ ووٹر کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے امیدواران کے بارے میں رائے دے سکیں کہ ان میں سے وہ کسی کو بھی ووٹ نہیں دینا چاہتے۔یہ معاشرے کے غالب سیاسی طبقے کے خلاف ایک طرح کا احتجاج ہے، جو کہ ووٹر کی جانب سے امیدواران کو مسترد کرنا ہے۔مندرجہ بالا میں سے کوئی نہیں کا انتخاب کرنا سیاسی طور پر آگاہ طبقے کا حق ہے کہ وہ یہ بات باور کروائیں کہ جن امیدواران کی فہرست دی گئی ہے ان میں سے کوئی بھی ووٹ دینے کے قابل نہیں ہے۔

ہم اپنے حق سے دستبرداری کو تسلیم نہیں کر سکتے اور نہ ہی یہ برداشت کر سکتے ہیں کہ ہماری رائے کو اہمیت نہ دی جائے۔مندرجہ بالا میں سے کوئی نہیں کا سیاسی نظام میں انتخاب کا موجود ہونا ووٹر کو اپنی رائے کے اظہار کا حق دیتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ یہ شہریوں کا اظہارِ رائے کی آزادی کا بنیادی حق ہے۔جمہوریت منتخب اور مسترد کرنے کا حق عوام کے ہاتھ میں دیتی ہے۔بیلٹ پیپر پر امیدواروں کو مسترد کرنے کا انتخاب موجود نہ ہونا جمہوریت کے اصولوں کے خلاف ہے۔جمہوریت کی روح سے امیدواروں کے بارے میں عدم اطمینان کا اظہار کرنا بالکل درست ہے، چند ممالک میں لوگ ووٹ کا اظہار اس صورت میں بھی کرتے ہیں کہ وہ اپنا ووٹ خالی کاغذ ڈال کر بھی درج کرواتے ہیں۔جن ممالک میں ووٹروں کے لیے مندرجہ بالا میں سے کوئی نہیں کا انتخاب موجود ہے ان میں کولمبیا، یوکرائن، برازیل، فن لینڈ، سپین، سویڈن، چلی، فرانس، بیلجیم، یونان، امریکہ کی چند ریاستوں کے ساتھ ساتھ انڈیا نے ۲۰۱۴ء جبکہ بنگلہ دیش نے ۲۰۰۸ء میں یہ اختیار عوام کو دیا۔

نوٹا کا انتخاب مختلف ممالک میں مختلف طریقوں سے کیا جاتا ہے، چند ممالک میں الیکشن کے عمل پر اس کا گہرہ اثر و رسوخ ہے۔اگر نوٹا کا انتخاب ۵۱ فیصد سے زیدہ لوگوں نے کیا ہو تو الیکشن دوبارہ کروائے جاتے ہیں۔لیکن چند ممالک ایسے بھی ہیں جہاں انتخاب تو موجود ہے لیکن یہ صرف عوام کی رائے لینے کی حد تک ہے رائے شماری میں ان ووٹوں کو شمار نہیں کیا جاتا جس کی بدولت الیکشن یا اس کے عمل پر ان ووٹوں کے کچھ اثرات مرتب نہیں ہوتے۔پاکستان میں اپریل ۲۰۱۳ء میں عوام کو یہ اختیار دینے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔الیکشن کمیشن آف پاکستان کی جانب سے اس انتخاب کو بہت سراہا گیا تھا لیکن ملک کے سیاسی حلقوں کی جانب سے اس کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔سیاست دانوں نے اس کو خیر منطقی اور غیر ضروری گردانتے ہوئے مسترد کر دیا۔چند نے یہ وجہ بیان کی کہ اس سے ووٹ نہ دینے اور سیاسی جماعتوں کو بدنام کرنے کے عمل کو حوصلہ افزائی ملے گی۔

پاکستان میں کل آبادی جو کہ ووٹ دینے کے قابل ہے اس کی کل تعداد ۱۱۴،۳۰۹،۵۱۶ ہے جس میں سے ۸۶،۱۸۹،۸۰۲ کے ووٹ رجسٹرڈ ہیں لیکن ان رجسٹرڈ ووٹوں میں سے بھی ۲۰۱۳ء کے الیکشن میں آدھے ووٹرز نے ووٹ دیا تھا جن کی تعداد ۴۶،۲۱۷،۴۸۲ ہے۔اس طرح ۲۰۱۳ء کے الیکشن میں ووٹر ٹرن آؤٹ ۵۳ فیصد رہا۔پاکستان کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جس کی آبادی میں نوجوان رائے دہندگان کی اکثریت ہے، جن کی رائے کے مطابق اس انتخاب کا بیلٹ پیپر پر موجود ہونا اس لیے ضروری ہے کہ پاکستان میں: کرپٹ سیاست دان، پرانے سیاست دانوں میں سے انتخاب کرنا کم اور زیادہ کرپٹ میں سے کسی کم کرپٹ کو منتخب کرنے کے مترادف ہے۔لیکن ان وجوہات کو ووٹ ڈالنے کے حق کے درمیان حائل نہیں ہونا چاہئے۔پاکستان کے شہریوں کے پاس بھی ہمسایہ ممالک انڈیا اور بنگلہ دیش کی طرح امیدواران کو مسترد کرنے کا اختیار ہونا چاہئے تاکہ وہ اپنا ووٹ ڈالنے کو نہیں بلکہ امیدواروں کو مسترد کریں تاکہ ووٹ نہ ڈالنے کی رسم کو ختم کیا جا سکے۔اس کی ایک مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ جب انڈیا نے ۲۰۱۴ء میں انتخاب میں نوٹا کو شامل کیا تو ووٹر ٹرن آؤٹ ۶۶ فیصد تھا جو کہ ملک کی تاریخ میں سب سے زیادہ تھا۔ہم بھی ووٹر ٹرن آؤٹ کی امید اسی صورت میں رکھ سکتے ہیں جب ہمارے پاس بھی یہ اختیار ہو کہ ہم امیدواروں کو مسترد کر سکیں۔

پاکستان دنیا کی پانچویں بڑی جمہوری ریاست ہے، ہم خود کو جمہوری ریاست میں کس طرح شمار کر سکتے ہیں جب تک کہ جب تک کہ ہم ان لوگوں کو رائے شماری کا حصہ نہ بنائیں جن کو سیاسی میدواروں پر اعتبار نہیں رہا جبکہ ابھی بھی ان کا اعتبار نظام پر برقرار ہے۔ نوٹا احتجاج کرنے اور پاکستان میں بہتر اور منصفانہ سیاست دانوں کو متعارف کروانے کے لیے بہترین طریقہ ہوسکتا ہے۔

اکثریت کی رائے یہ ہوسکتی ہے کہ نوٹا کو متعارف کروانا اتنا ضروری نہیں ہے اگر وہ امیدواران سے نا امید ہیں تو وہ ووٹ نہ ڈالیں۔ دراصل ووٹ نہ ڈالنے کی حوصلہ افزائی کرنا نوٹا کا مقصد نہیں ہے بلکہ اگر نوٹا متعارف ہوجاتا ہے تو اس سے یہ ہوگا کہ ان لوگوں کو بھی شمار کیا جاسکے گا جو کہ الیکشن اور الیکشن کے عمل کو اہم جانتے ہیں اور ووٹ ڈال کر اپنے حق کا استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی انتخابی اصلاحات متعارف کروانے سے پہلے عوام کو اس حوالے سے آگاہ کرنا نہایت ضروری ہے جس کے لیے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پیغامات چلائے جاسکتے ہیں، سرکاری اداروں میں آگاہی مہمات، بینر، پوسٹر اور سوشل میڈیا کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

نوٹا ووٹروں کی امیدواروں کے انتخاب کے بارے میں رائے لینے میں نہایت مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ اگر نوٹا کی اکثریت زیادہ ہو تو اس صورت میں سیاسی جماعتوں کو اپنے امیدوار تبدیل کرنا ہوں گے۔ اس طرح امیدواروں کا احتساب کرنا اور کسی بھی جماعت کے اندر ہونے والی اصلاحات کی بھی حوصلہ افزائی ہوگی۔ بہتر اور شفاف ریکارڈ رکھنے والی امیدواروں کی نہ صرف حاصلہ افزائی ہوگی بلکہ وہ ملک نے نظام میں بھی بہتر کردار ادا کرسکیں گے۔ اس کے علاوہ سیاسی جماعتوں کے بار بار نامزد کردہ ایک ہی امیدوار کے مسترد ہونے کی صورت میں سیاسی جماعتوں کو مجبوراً نئے اور قابل لوگ متعارف کروانے پڑیں گے جس کی بدولت جمہوریت بھی بہتر ہوگی۔ جمہوریت کے نئے معیارات کو اپنانا جمہوری ممالک کے لیے نہایت ضروری ہے۔

ان ممالک کی فہرست جہاں نوٹا یا احتجاجی ووٹ دیے جانے کا حق عوام کو حاصل ہے

| ممالک | ووٹ ڈالنے کا طریقہ کار | انتخاب کا طریقہ |
|---|---|---|
| فرانس | الیکٹرانک | نوٹا/مندرجہ بالا میں سے کوئی نہیں |
| بیلجیم | الیکٹرانک | نوٹا/مندرجہ بالا میں سے کوئی نہیں |
| برازیل | بیلٹ پیپر | نوٹا/مندرجہ بالا میں سے کوئی نہیں |
| یونان | بیلٹ پیپر | نوٹا/مندرجہ بالا میں سے کوئی نہیں |
| یوکرائن | بیلٹ پیپر | نوٹا/مندرجہ بالا میں سے کوئی نہیں |
| چلی | بیلٹ پیپر | نوٹا/مندرجہ بالا میں سے کوئی نہیں |
| بنگلہ دیش | بیلٹ پیپر | نوٹا/مندرجہ بالا میں سے کوئی نہیں |
| نیواڈا (امریکہ) | بیلٹ پیپر | نوٹا/مندرجہ بالا میں سے کوئی نہیں |
| فن لینڈ | بیلٹ پیپر | خالی ووٹ یا تحریر |
| سویڈن | بیلٹ پیپر | خالی ووٹ یا تحریر |
| کولمبیا | بیلٹ پیپر | خالی ووٹ |
| سپین | بیلٹ پیپر | خالی ووٹ |
| انڈیا | الیکٹرانک | نوٹا/مندرجہ بالا میں سے کوئی نہیں |

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

# پاک۔ترک اسکولز

تحریر: سندس سیدہ

حال ہی میں ترکی میں ہونے والی فوجی بغاوت کے بعد جب یہ دعویٰ کیا گیا کہ پاکستان میں قائم پاک ترک اسکول گولن تحریک کے تحت قائم کیے گئے ہیں۔ گولن تحریک فتح اللہ گولن نامی اس ترک مسلم مبلغ کی تحریک کا نام ہے، جو امریکہ میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں اور جنہیں ترک حکومت ناکام فوجی بغاوت کا ذمے دار قرار دیتی ہے جبکہ خود گولن اپنے خلاف ان الزامات کی سختی سے تردید کرتے ہیں۔ ترکی کے وزیر خارجہ اور ترکی کے سفیر نے حکومت پاکستان سے گولن فاؤنڈیشن کے تحت چلنے والے تمام اسکول فوری طور پر بند کرنے اور ان کا انتظام گولن فاؤنڈیشن سے لے کر سرکاری کنٹرول میں دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ جس کے بعد خبر آئی کہ اسکول نیٹ ورک کے پرنسپلز کو عہدوں سے ہٹانے اور تعلیمی ادارے چلانے والی تنظیم کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو تحلیل کر دیا گیا ہے۔ لیکن فوراً بعد اس خبر کی تردید کر دی گئی کہ ایسا کچھ بھی نہ تو کیا گیا ہے اور نہ ہی ایسا کچھ کرنا ممکن ہے۔ پاک ترک انٹرنیشنل اسکول اینڈ کالج کی ویب سائیٹ پر موجود معلومات کے مطابق یہ اسکول اینڈ کالج کا نیٹ ورک ۱۹۹۵ء میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ اسکول اور کالج پاکستان کے ۹ شہروں لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد، ملتان، کراچی، حیدر آباد، خیر پور، جامشورو اور کوئٹہ میں قائم ہیں۔ جن میں سے ۲۳ اسکول و کالج کے کیمپس کے نام بھی ویب سائیٹ پر موجود ہیں۔ یہ اسکول و کالج کا نیٹ ورک محض تعلیم مہیا نہیں کر رہا بلکہ ان کے زیرِ اہتمام طلبہ کے لیے کیمپ اور انٹرنیشنل ٹورز کا اہتمام کرنے کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے کلب بھی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بچوں کو مختلف غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی مشغول رکھا جاتا ہے۔

ترکی میں جب فوجی بغاوت کے بعد پاک ترک اسکولوں پر سوالات اٹھائے جانے لگے تھے اور یہ کہا جانے لگا تھا کہ یہ اسکول بند ہونے چاہئیں بحرحال اس کا حل یہ نکالا گیا ہے کہ اسکول سسٹم کے انتظامی معاملات سنبھالنے کے لیے ایڈمنسٹریشن کو تبدیل کیا جائے گا کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے اسکولوں کو مستقل طور پر بند کر دیا جائے۔ محض سفارتی تعلقات بہتر رکھنے کے لیے اسکول کے نیٹ ورک کو بند کرنا جس کی بدولت اساتذہ، ایڈمنسٹریشن اور والدین متاثر ہوں گے کسی طور بھی ممکن نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ تعلیم کی ذمہ داری حکومت کے سر ہے لیکن پھر بھی بہت سے غیر سرکاری اور این جی اوز اسکولز مل کر اس ذمہ داری کو بھرپور طریقے سے نہیں نبھا پا رہے۔ کہیں کوئی کمی ہے جو شاید مختلف نظامِ تعلیم رائج ہونے، نصاب کا بہتر نہ ہونے اور حکومتی عدم توجہی کی وجوہات کی بنا پر پوری نہیں ہو پا رہی۔ پاکستان میں ایسے تعلیمی ادارے بھی ہیں جو خاص مکتبہ فکر کے نظریات کو فروغ دیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ جدید تعلیم بھی دی جاتی ہے، دوسری جانب غیر ملکی اسکول جن میں وہ اسکول بھی شامل ہیں جو کسی تحریک کے تحت قائم کیے گئے۔ ایسی کئی مثالیں ہیں جہاں ہماری حکومت کی جانب سے چھوڑے گئے خلاء کی وجہ سے بہت سے ادارے اور تحریکیں آگے آئیں اور انہوں نے ہمارے تعلیمی نظام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ان اسکولوں میں کیا پڑھایا جاتا ہے اساتذہ کن نظریات کے فروغ کی بات کرتے ہیں۔ اسکولوں میں غیر نصابی سرگرمیاں کیا ہوتی ہیں اس حوالے سے مکمل معلومات لینا نہایت ضروری ہے۔

تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے دہشتگرد اور انتہا پسند تنظیموں نے اب نوجوانوں کو اپنی صفوں میں کھڑا کرنے کے لیے نظامِ تعلیم اور اساتذہ کا سہارا لینا شروع کر دیا ہے۔ آئے دن ہم یہ سنتے ہیں کہ کسی دہشتگردی کی کاروائی میں ملوث نوجوان تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ سننے کے بعد اکثر رائے دی جاتی ہے کہ کوئی بھی تعلیم یافتہ شخص بربریت کا مظاہرہ کیسے کر سکتا ہے؟ اس کی جڑ وہ نظامِ تعلیم اور اساتذہ ہیں جو کسی خاص نظریات کو فروغ دیتے ہیں۔ ہمارے نوجوان زرخیز مٹی کی مانند ہیں لیکن بدقسمتی یہ کہ زرخیز مٹی میں اگر خار بھی بو دیے جائیں تو وہ اس فصل کو بھی اپنے خون سے سینچتی ہے۔ تعلیمی نظام پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے ورنہ ہمارے نوجوان بطور ہتھیار دشمن کے ہاتھوں استعمال ہو سکتے ہیں۔ جب نوجوانوں کو مناسب تعلیم، شعور اور آگاہی فراہم نہ کر سکنے جیسے جرائم مرتکب ہوتے ہیں تو پھر یقیناً ہمیں اس کے سنگین نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔

میں اس بات سے اختلاف کرتی ہوں کہ ترقی یافتہ ممالک میں جہاں تعلیم عام ہوتی ہے وہاں جرائم کی شرح کم ہوجاتی ہے۔اب یہ وہ دور ہے جہاں زیادہ تعلیم یافتہ لوگ بہتر اور منظّم طریقے سے کوئی بھی جرائم، دہشتگردی کی کاروائی یا انتہا پسندی کو فروغ دے سکتے ہیں۔آپ کے سامنے ایک چھوٹی سی مثال پیش کرتی ہوں ایک کورس جس کا نام "ایتھیکل ہیکنگ" ہے۔اس کورس میں ہیکنگ کے منظّم اور اخلاقی طریقہ کار بتائے جاتے ہیں۔لیکن کوئی بھی نوجوان اس کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرسکتا ہے۔اکثر آپ نے سنا ہوگا کہ کسی ملک کی کوئی سرکاری ویب سائیٹ ہیک کرلی جاتی ہے۔جس کی بدولت ہیک کرنے والے کو اس ویب سائیٹ سے منسلک تمام ای میل ایڈریس اور معلومات تک بھی رسائی حاصل ہوجاتی ہے وہاں پر موجود معلومات کو ہیک کرنے والے اپنے مقاصد کے لیے بھی استعمال کرسکتے ہیں، یہ ہی وجہ ہے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کی درست سمت راہنمائی نہایت ضروری ہے۔نظامِ تعلیم اور نصاب کے لیے مخصوص فریم ورک ہونا چاہیئے جس کے اندر کام کرتے ہوئے تعلیمی ادارے آزاد ہوں۔اگر تعلیمی ادارے مخصوص دائرہ کار میں رہتے ہوئے کام کریں گے تو احتساب کے عمل کو یقینی بنایا جاسکے گا۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی
حیثیت سے کام کررہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

# پیارے افغانستان کے نام

حمزہ خان

پاکستان کی وفاقی کابینہ نے ملک میں افغان مہاجرین کے قیام کی توسیع کر دی ہے۔ افغانی اپنے رجسٹریشن کارڈز دکھا کر مارچ ۲۰۱۷ء تک باحفاظت رہ سکتے ہیں۔ کیا یہ ستم ظریفی نہیں ہے کہ پاکستان میں مقیم لاکھوں افغان مہاجرین کی قسمت کا فیصلہ کابینہ کی پالیسی میں تبدیلی پر مبنی ہے؟ کاش ان کی قسمت کا فیصلہ انسانی حقوق کے اصولوں پر کیا جاسکتا۔ مگر کون سے انسانی حقوق؟ پاکستان تو کسی بھی بین الاقوامی مہاجرین کنونشن یا پروٹوکول کا فریق نہیں مگر اس صورتحال میں کون سا ایسا ملک ہے جو محض انسانی حقوق کی فراہمی پر پوری طرح قائم ہے؟ دنیا بھر میں لاکھوں منتشر افراد کو مسائل کے رحم کو کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے، جبکہ پاکستان میں بسنے والے تقریباً ۲۵ لاکھ افغان مہاجرین سکون سے زندگی بسر کرنے کے ساتھ ساتھ کاروبار بھی کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ افغان پناہ گزین اکثر قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے ٹیلی ویژن سکرین کے سامنے بے چینی کابینہ کی پالیسی کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں یہ بات بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بہت سے افغانی ملک کے بیشتر حصوں میں مزدوری کرنے میں مگن ہوں گے، جبکہ چند پاکستان کی اقتصادی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کر رہے ہیں، چند ہوٹلوں اور ڈھابوں پر بھی کام کر رہے ہوں گے۔ کراچی سے گلگت سامان پہنچانے کے ساتھ ساتھ بیشتر پیشوں میں مصروف ہوں گے۔ افغانی مرد، عورتیں اور بچے ہر طرح کے کام کر رہے ہیں جن میں گھر کے کام، مزدوری، اور تجارت شامل ہیں۔ پھر بھی بیشتر لوگ یہ سوچتے ہیں کہ یہ لوگ دہشتگرد، ڈاکو اور چور ہیں اور پاکستان کے لیے خطرہ کا سبب ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ایک جانب ہم یہ کہتے ہیں کہ تمام پاکستانی دہشتگرد اور انتہا پسند نہیں ہیں اور دوسری جانب ہم تمام افغانیوں کے لیے ایسی سوچ رکھتے ہیں کہ وہ دہشتگرد ہیں۔

گزشتہ سالوں میں، افغان مہاجرین کا پاکستان میں آنا، ملک میں بڑھتی ہوئی انتہا پسندی اور ہمارے خطے میں عالمی طاقتوں کا ملوث ہونا حقیقت ہے۔ افغانیوں کے ساتھ ہمارا تعلق بہت پرانا ہے۔ قدیم نسلی، لسانی اور جغرافیائی تعلق کی وجہ سے ہم جدا نہیں ہو سکتے۔ یہ درست ہے کہ جنگ میں ہم نے ان کی مدد کی تھی۔ مگر یہ کیا ہوا؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مدد کرنا خطے میں اسٹریٹیجک غلبہ حاصل کرنے کی چال کے سوا کچھ نہیں تھا، امداد کے نام پر اربوں ڈالر لینا اور اس بات کا اظہار کرنا کہ پاکستان دنیا میں مسلمان اتحاد اور بھائی چارے کی علامت ہے۔

شامی پناہ گزینوں کا بحران ایک مرتبہ پھر پوری دنیا کے لیے توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ ہمارے وزیراعظم اور ان کی کابینہ کو اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ پاکستان میں رہنے والے افغان مہاجرین کیا محض مہاجرین ہیں یا غیر قانونی اقتصادی کارکنان بھی ہیں؟ کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ۳۷ سالہ مسائل کو افغان مہاجرین کی وطن واپسی کی بدولت حل کیا جاسکتا ہے؟ ان افغانیوں کا کیا جنہوں نے یہاں شادی کی ہے ان کے کاروبار یہاں ہیں لیکن ان کے خاندان ان کے ملک میں ہیں؟ ان نوجوانوں کا کیا جو اسکولوں اور کالجوں میں زیرِ تعلیم ہیں؟ فرض کریں تمام افغان وطن واپس بھی بھیج دیے جائیں، مگر کیا ان کو پاکستان میں غیر قانونی طور پر کام کرنے سے روکا جائے گا؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ افغانستان نے تنازعہ حل کر لیا ہے اور مواقعے بڑھتے جا رہے ہیں۔ کوئی بھی قابلِ احترام شخص یہ نہیں چاہے گا کہ اسکو کہیں بھی ہراساں کیا جائے۔ اگر افغانی اپنے ملک میں محفوظ ہوں تو وہ اپنے وطن واپس جانے میں کیوں دیر کریں گے؟

یہ درست ہے کہ ۲۰۱۴ء میں پشاور کے سکول پر ہونے والا حملہ اور طورخم بارڈر پر ہونے والی حالیہ جھڑپیں پاکستان اور افغانستان کی ریاستی فرقہ بندی کو مزید گہرا کر رہی ہیں۔ ان تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پاکستان کو افغان ریاست کی بڑھتی ہوئی دشمنی اور اجڑے ہوئے افغان مہاجرین میں ذمہ داری کے ساتھ فرق کرنا چاہئے۔ افغانستان کی جانب بھارت کی بڑھتی ہوئی دلچسپی بھی افغانستان کے ساتھ حالات میں تبدیلی کا باعث ہے۔ بین الاقوامی طاقت اور سیاست کے اظہار، اور افغانستان پر دباؤ ڈالنے کے لیے مہاجرین کو استعمال کر سکتا ہے لیکن ۲۵ لاکھ مہاجرین کی تعداد ایک بڑی تعداد ہے۔ کیا ایسا قدم اٹھانا مناسب ہوگا؟ ریاست کے ساتھ ریاستی تعلقات کو افراد کے قدیم بھائی چارے اور ثقافت سے جدا دیکھنا چاہئے۔

انسانی حقوق کے تحفظ فراہم کرنے والے اداروں کے خیال میں افغان شہریوں کے انسانی حقوق اور اقدار کی پامالی کی اہم وجہ پاکستان میں سیاسی پناہ لینے والوں کے لیے

کمزور قوانین اور قانون کی حکمرانی کی عدم موجودگی ہے۔ میڈیا افغانیوں کے بارے میں دقیانوسی تصورات کو فروغ دیتا ہے، زیادہ تر ایسے افغان باشندوں کی مثالیں سامنے لائی جاتی ہیں جو جھونپڑیوں میں رہتے ہیں یا جرائم پیشہ ہیں لیکن ان لوگوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو کہ جب پاکستان آئے تھے تو خالی ہاتھ تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے قانونی طور پر یہاں کاروبار قائم کیا اور وہ ٹیکس بھی دیتے ہیں۔ بین الاقوامی ممالک کی جانب سے افغان مہاجرین بحران پر غفلت برتی جا رہی ہے۔ افغان مہاجرین کے مسئلے پر شاز و نادر ہی کوئی تعلیمی تحقیق سامنے آتی ہے اور اگر آتی بھی ہے تو اس کا تعلق یو این ایچ سی آر اس خطے میں کردار اور پاکستان میں کتنے افغان پناہ گزین رہ رہے ہیں بس اسی حوالے سے ہوتا ہے۔ اختلافات کے باوجود ہم نے افغانیوں کو اپنے گھر میں خوش آمدید کہا تھا، جس کی بدولت ہمارا رشتہ مزید مضبوط ہو گیا۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ دونوں قوموں نے دہشتگردی کے خلاف جنگ کے مضمرات کا سامنا کیا ہے۔ شاید صوبائی حکومتوں اسٹریٹجک پروگراموں کو مرتب اور ڈیزائن کرنے کے لیے جس سے افغانیوں کی قومیت کی قانونی حیثیت اور پاکستان کی معیشیت میں ان کا کردار واضح ہو اس کے لیے بین الاقوامی ایجنسیوں کو شامل کر سکتی ہیں۔ تاہم وفاقی حکومت بین الاقوامی امیج کو بہتر بنانے اور ڈیورنڈ لائن پر جاری کشمکش کے مسئلے پر افغان مہاجرین کی بدولت مستفید ہو سکتی ہے۔ پاکستان میں اگر اس مسئلے سے سختی سے نمٹا گیا تو ہمارے ملک میں ہمارے لوگوں کے درمیان روابط مشکل کا شکار ہو جائیں گے۔ بہر حال، پاکستان کو دنیا کو یہ منوانا ہے کہ بیشمار مسائل کے باوجود پاکستان میں افغان مہاجرین کے مسئلے سے نمٹنے کے لیے سمجھداری اور ذمہ داری سے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ مگر خطرہ تو اس بات کا ہے کہ کہیں ہم نفرت اور دشمنی کی آگ بھڑکا کر اپنے پڑوسی سے محروم نہ ہو جائیں۔


مصنف انڈ ویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام مینیجر کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

# معلومات کا حق

تحریر: ماریہ افتخار

اگر آپ کا کبھی سرکاری دفتر جانے کا اتفاق ہوا ہو تو پھر آپ کو بخوبی علم ہوگا کہ کس طرح گھن چکر میں ایک سے دوسرے کمرے میں گھومنا پڑتا ہے۔ اور کس طرح سے سرکاری ملازمین معلومات کی فراہمی میں سرد مہری اور لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں اور یوں آپ کا سارا دن چکر کاٹنے میں گزر جاتا ہے۔ اور آپ کا اپنا جائز کام کروانے کے لیے خوش آمد اور رشوت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ لیکن ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم اس ملک میں رہ رہے ہیں جہاں پر معلومات کا حق یا جاننے کا حق موجود ہے۔ لیکن پھر بھی سینٹر فار لا اینڈ ڈیموکریسی کی رپورٹ کے مطابق دنیا کے ۹۵ ممالک میں سے معلومات تک رسائی کے حوالے پاکستان کا معلومات کی فراہمی کے حوالے سے نمبر ۷۲ ہے جو کہ کافی تشویش ناک بات ہے۔ یہ قانون پورے پاکستان میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے لیکن خیبر پختونخواہ میں اس قانون میں ترامیم کی گئی ہیں جس کی بدولت اسے شہریوں کے لیے مزید آسان بنا دیا گیا ہے۔ البتہ ماہرین کا کہنا ہے اصل میں حقیقت کچھ اور ہے۔ پشاور سے تعلق رکھنے والے ایک صحافی، عزیز بونیری کا کہنا ہے کہ 'اس قانون نے عوام کی امیدوں بلاوجہ بڑھا دی ہیں، جو سمجھتے ہیں کہ وہ حکومتی اداروں کے پاس موجود معلومات تک رسائی حاصل کر لیں گے، اور یہ حق انہیں آئین فراہم کر رہا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔' انہوں نے مزید بتایا کہ اس قانون کے تحت انہوں نے ریسکیو 1122 کے اخراجات جاننے کے لئے ایک درخواست بھیجی، مگر نا تو انہیں بیس دن کے اندر کوئی معلومات فراہم کی گئیں اور تقریباً چھ ماہ کے بعد جب یہ معلومات انہیں ملیں تو وہ بھی اخراجات کے بجائے ریسکیو 1122 کے بجٹ کے حوالے سے تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک تو اس طریقہ کار میں بہت سے مسائل ہیں اور دوسرا یہ کہ یہ قانون معلومات تک رسائی کو آسان بنانے کی بجائے مزید مشکل بنا رہا ہے۔ خیبر پختونخواہ کے اطلاعات کے ڈیپارٹمنٹ کے علاوہ کسی اور ادارے نے معلومات تک رسائی کے عمل کو آسان بنانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ صوبے کی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام اداروں کو معلومات تک رسائی کے قانون کے مطابق عمل کو آسان اور یقینی بنانے کا کہے۔ انہی خیالات کا اظہار جناب محمد انور بھی کرتے ہیں، جو سینٹر فار گورننس اینڈ پبلک اکاؤنٹ ایبلٹی کے ایگزیکٹیو ڈائرکٹر ہیں۔ البتہ خیبر پختونخواہ کے انفارمیشن کمیشن کے سربراہ کا خیال ہے کہ معلومات تک رسائی کے زیادہ تر مسائل رازداری کی وجہ سے ہیں۔ چونکہ ماضی میں ایسے قوانین موجود تھے جو رازداری کو فروغ دیتے تھے اس لئے اس کلچر کو بدلنے میں کچھ وقت لگے گا۔ البتہ انہوں نے اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ چونکہ یہ کمیشن ابھی نیا ہے اس لئے اسے اپنے ضابطہ اخلاق وضع کرنے میں کچھ وقت ضرور لگے گا۔

یہاں قارئین کو بتاتی چلوں ۲۳ جون ۲۰۱۵ء میں صوبائی اسمبلی کے اراکین کو ایکٹ سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا جس کی شہریوں کی جانب سے حوصلہ شکنی کی گئی لہذا اسی سال قانون میں ترامیم کر کے ممبرانِ صوبائی اسمبلی کو قانون کے دائرہ کار میں دوبارہ شامل کیا گیا ہے۔ ۲۳ فروری ۲۰۱۶ء میں مجوزہ قانون کے حوالے سے اجلاس میں چند میں واضع کیا گیا کہ:

☆ رجسٹرڈ ادارے، سماجی تنظیمیں اور ہائی کورٹ، آر ٹی آئی کو مطلوبہ معلومات فراہم کرنے کی پابند ہوں گی۔

☆ سزاوار کو ہائی کورٹ میں اپیل دائر کرنے کا حق اور ہائی کورٹ اپیل کا فیصلہ ۶۰ دنوں میں کرنا ہوگا۔

☆ کمیشن انفارمیشن کمشنر کی مدت ملازمت ختم ہونے سے ۱۲۰ دن پہلے نئی تقرری کے لئے کیس تیار کر کے صوبائی حکومت کے نوٹس میں لائیگا۔

☆ حکومت انفارمیشن کمشنر کی ریٹائرمنٹ کے بعد ۳۰ دن کے اندر نئی تعیناتی یقینی بنائیگی۔

لیکن ان ترامیم پر عمل درآمد ہونے کے بارے میں کوئی معلومات ابھی تک سامنے نہیں آئی۔ یہاں ایک بات پریشان کن ہے کہ معلومات کے صفحوں کی تعداد ۲۰ سے زائد ہونے کی صورت میں شہری پر رقم ادا کرنے کا بوجھ پڑنے سے شہریوں کی حوصلہ شکنی بھی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے مین بھی کوئی مناسب اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے۔

خیبر پختونخواہ انفارمیشن کمیشن کی ویب سائیٹ پر اگست ۲۰۱۴ء سے فروری ۲۰۱۶ء تک مختلف محکموں کے ۱۱ نامزد کردہ افسران کو شوکاز نوٹس جاری کیے گئے ہیں جبکہ جولائی ۲۰۱۵ء سے جولائی ۲۰۱۶ء تک ۸ افسران پر جرمانہ بھی عائد کیا جا چکا ہے۔ یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ جرمانے کی رقم کا ۷۰ فیصد شکایت کرنے والے کو دیا جاتا ہے۔ شہریوں کی جانب سے دائر کی گئی شکایات میں وقت کے ساتھ حوصلہ افزاء اضافہ دیکھنے میں آیا۔ سال ۲۰۱۴ء میں ۲۹۰ درخواستیں موصول ہوئیں، ۲۰۱۵ء میں ان کی تعداد ۱۰۹۱ ہوگئی اور ۲۰۱۶ء میں ۲۵ اگست تک موصول ہونے والی کل درخواستوں کی تعداد ۹۴۴ ہے۔ یہاں یہ بات توجہ طلب ہے کہ ایسے صوبے میں جہاں خواتین اپنے شوہر سے بھی سوال نہیں پوچھ سکتیں اس ہی صوبے کے سرکاری محکموں کو ۲۰۱۴ء میں ۲۹، ۲۰۱۵ء میں ۱۴۳ جبکہ ۲۰۱۶ء میں اب تک ۵۳ خواتین نے معلومات کے حصول کے لیے

درخواستیں جمع کروائیں ہیں۔ یقیناً یہ نہایت حوصلہ افزاء امر ہے۔

دیگر صوبوں کی بات کی جائے تو سندھ فریڈم آف انفارمیشن آرڈیننس ۲۰۰۵ء اور بلوچستان فریڈم آف انفارمیشن آرڈیننس ۲۰۰۶ء کا معلومات کا حق کے قانون سے کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب کہ پنجاب کا معلومات کا حق کا قانون سست روی کا شکار معلوم ہوتا ہے اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ پنجاب کی ویب سائیٹ پر ۲۰۱۵ء اکتوبر کے بعد سے اپ ڈیٹ نہیں کی گئی۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ خیبر پختونخواہ کے شہریوں کے لیے دو ویب سائیٹس موجود ہیں جن میں سے ایک پر صوبے کے تمام محکموں کے تمام منصوبوں، اور بجٹ کے حوالے سے معلومات فراہم کی گئی ہے۔ دوسری ویب سائیٹ پر یہ سہولت دی گئی ہے کہ کوئی بھی آن لائن کمپلینٹ درج کروا سکتا ہے اور اس کا سٹیٹس بھی دیکھ سکتا ہے۔

پنجاب انفارمیشن کمیشن کی ویب سائٹ اور مزید معلومات اور پیش رفت کے بارے میں جاننے کے لئے ہم نے چیف انفارمیشن کمیشنر جناب مختار احمد علی سے بات کی۔ پاکستان میں آر ٹی آئی قوانین کی بات ہو اور مختار احمد علی صاحب کا ذکر نا ہو یہ ممکن نہیں۔ جب ہم نے اُن کے سامنے اپنے سوالات پیش کیے تو انہوں نے نہایت معصومیت سے ہر مسئلے کی وجہ سٹاف کی کمی بتایا۔ انہوں نے مزید وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا کہ کمیشن سروس رولز پنجاب حکومت کو منظوری کے لئے بھیج چکا ہے۔ منظوری کے بعد ہی نئے سٹاف کی بھرتی ممکن ہو سکے گی۔ البتہ انہوں نے بتایا کہ کمیشن اپنے محدود وسائل میں کام جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس سال کمیشن کو ۳۰۰۰ سے زائد شکایات موصول ہوئیں جن میں سے تقریباً ۵۰ فیصد کو نمٹا دیا گیا ہے۔ انہوں نے این جی اوز کے کردار کو سراہتے ہوئے کہا کہ پہلے کی نسبت عوام اب جاننے کے حق سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ عوام کی جانب سے بھیجے جانے والی درخواستوں اور شکایات میں ہر روز اضافہ ہو رہا ہے۔

مزید ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق کمیشن نے کئی مواقع پر مختلف اداروں کے پبلک انفارمیشن افسران کو سمن جاری کیئے ہیں جنہوں نے عوام کی معلومات تک رسائی میں مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی کے انفارمیشن افسر ڈاکٹر عابد کو کمیشن نے ایک سائل کو معلومات نا فراہم کرنے کے نتیجے میں طلب کیا گیا۔ سائل نے یونیورسٹی کی فیکلٹی پوزیشنوں پر بھرتی کے طریقہ کار کے بارے میں معلومات طلب کیں تھیں۔ کمیشن نے ڈاکٹر عابد کو یہ معلومات فراہم کرنے کا پابند کیا۔ اسی طرح دیگر مواقع پر بھی کمیشن نے انفارمیشن افسران کی طلبی کی۔ معلومات کا حق مجھے اور آپ کو خدمات کی ترسیل میں آسانی فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ بدعملی اور کرپشن کی روک تھام احتساب، شفافیت اور گڈ گورننس کو یقینی بناتا ہے۔ کیا آپ احتساب چاہتے ہیں؟ اگر ہاں! تو معلومات کا حق استعمال کریں اور جانیں کہ آپ کا پیسہ، آپ کے لیے کام کرنے والے کہاں اور کیسے استعمال کر رہے ہیں۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی
حیثیت سے کام کر رہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

# دہشتگردی ایک کاروبار

تحریر: حور کاکڑ

کہنے کو تو دہشتگردی ایک عام سا لفظ نظر آتا ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اتنا ہی پیچیدہ ہے۔ اس کی پیچیدگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہزار ہا کوششوں کے باوجود بھی یہ کسی نا کسی شکل میں اپنا وجود قائم رکھتا ہے۔ حال ہی میں یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے لوگوں نے دہشتگردی کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اسی طرح جرائم چھوٹے ہوں یا بڑے وہ بھی دہشتگردی کو ہوا دینے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ یقیناً ایسے کاروبار موجود ہیں جو دہشتگردی کی وجہ سے پنپتے ہیں۔ جیسا کہ دہشتگردی کے خلاف جنگ ریاست کی اسلحہ بنانے والی انڈسٹری کے لئے ایک کاروبار ہے، اسی طرح ایک دہشتگرد گروہ کے لئے فلاح و بہبود کا کام یا ایسے کسی گروہ کا نام استعمال کرتے ہوئے کوئی بھی کام کرنا ایک کاروبار کی حیثیت رکھتا ہے۔

مختصراً، یہ کہنا درست ہے کہ دہشتگردی ایک کاروبار ہے۔

تنازعات اور پیسے کا تعلق بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ جنگ بھی ایک کاروبار ہے اور دہشتگردی ایک ایسی جنگ ہے جو عوام میں گھبراہٹ اور خوف پھیلاتی ہے۔ اس لئے دہشتگردی کو نہایت منافع بخش کاروبار تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال نائن الیون کے بعد امریکہ کی عراق اور افغانستان کے خلاف جنگ ہے۔ امریکہ نے ان دونوں ممالک کے خلاف جنگ کا جو بھی جواز پیش کیا اس کا سب سے زیادہ فائدہ امریکہ کی اسلحہ بنانے والی انڈسٹری کو ہوا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ۲۰۰۱ میں دہشتگردی کے خلاف جنگ کے آغاز سے لے کر اب تک امریکہ کی اسلحہ بنانے والی کمپنیوں کے منافع میں ۵۱ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ اس جنگ کے نتیجے میں دنیا بھر میں اسلحے کی برآمدات میں بھی بے حد اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ حال ہی میں سعودی عرب کی جانب سے یمن کے خلاف جنگ سے دنیا کے پانچ میں سے تین بڑے اسلحہ برآمد کرنے والے ممالک کو بے حد فائدہ ہوا۔ ان ممالک میں امریکہ، برطانیہ اور فرانس شامل ہیں۔ اس سلسلے میں ہونے والی ڈیلز سے سعودی عرب سمیت ان تینوں ممالک کو کافی فائدہ ہوا، البتہ اس جنگ کو زیادہ عرصہ جاری رکھنا ممکن نہیں رہا۔

پاک چین راہداری منصوبہ کہنے کو تو ایک تجارتی راستہ ہے مگر دہشتگردی کے ڈر سے پاکستان نے اس کی حفاظت کیلئے ۱۵۰۰۰ اہلکاروں پر مبنی ایک سیکیورٹی ڈویژن قائم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اس ڈویژن کو قائم کرنے کے لئے تقریباً ۵۲۶.۲ ملین روپے کا تخمینہ لگایا گیا ہے جس میں ۱۰۰ ملین وزارت خزانہ جاری کر چکا ہے۔ اس اسپیشل سیکیورٹی ڈویژن کا قیام دہشتگردی اور کاروبار کے باہمی تعلق کو سمجھانے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ متنازعہ اور سیلاب زدہ علاقوں میں آئی ڈی پیز کی آبادکاری کے لئے قومی اور بین الاقوامی اداروں کی جانب سے بھیجی جانے والی امدادی رقوم بھی ملک میں پیسے کی آمد کا ذریعہ بنتا ہے۔

مقامی سطح پر بھی دہشتگردی چھوٹی بڑی کمپنیز کے کاروبار میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ بڑے شہروں میں جرائم کے واقعات میں اضافے کے باعث سیکیورٹی کمپنیوں کے کاروبار میں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ پیسوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو سیکیورٹی انڈسٹری عربوں روپوں پر مبنی انڈسٹری ہے۔ خصوصاً ۲۰۰۰ء سے اس کاروبار میں بے حد اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ اس لئے یہ کہنا غلط نا ہوگا کہ اس سال لاہور میں بچوں کے اغوا کے بڑھتے ہوئے واقعات سے بھی اس انڈسٹری کو خاصہ فائدہ حاصل ہوا ہوگا۔

دہشتگرد گروہ بھی اپنے وسائل بڑھانے کے لئے کوئی نا کوئی کاروبار کرتے رہتے ہیں۔ اغوا برائے تاوان، منشیات یا پھر خیراتی یا فلاحی اداروں کی صورت میں یہ گروہ اپنے وسائل میں اضافہ کرتے نظر آتے ہیں۔ خصوصاً فلاحی کاموں کے ذریعے یہ گروہ عوامی حلقوں میں گھر کرنے میں آسانی سے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ایسے بہت سے ادارے موجود ہیں جو فلاحی کاموں میں ریاستی اداروں سے بھی آگے ہیں اور عوام اپنا پیسہ کسی کرپٹ انسان کو دینے کی بجائے ان گروہوں کو دینا پسند کرتے ہیں۔ ایسے بہت سے فلاحی ادارے موجود ہیں جو دہشتگرد تنظیموں سے تعلق رکھتے ہیں اور چونکہ عوام کو ایسے کسی تعلق کا علم نہیں ہوتا اس لئے وہ انہیں اپنے پیسے دیتے رہتے ہیں۔ اس سے ان گروہوں کو دوگنا فائدہ ہوتا ہے، ایک تو عوام میں ان کی مثبت عکاسی ہوتی ہے اور دوسرا ان کے وسائل میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جو حکومت کی ناک

کے نیچے جاری ہے۔ حالانکہ حکومت نے قومی ایکشن پلان کے تحت ایسے تمام گروہوں کے وسائل ختم کرنے کا عہد کیا تھا مگر یوں معلوم ہوتا ہے یا تو حکومت قومی ایکشن پلان پر اپنی گرفت کھو چکی ہے یا پھر حکومت کبھی یہ گرفت رکھتی ہی نہیں تھی۔ اب تو حالات اس حد تک خراب ہو چکے ہیں کہ بہت سے ادارے چھوٹے موٹے گروہوں کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں اور جرائم اور دہشتگردی کے باہمی تعلق کو مزید مضبوط کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے بہت سے ادارے فراڈ اسکیموں کے ذریعے عوام کا پیسہ لوٹتے ہیں اور دہشتگرد تنظیمیں انہیں مدد فراہم کرتی ہیں۔ بعض اوقات ایسا ایک سے نظریات کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اور بعض اوقات محض کاروبار کے لئے کیا جاتا ہے۔ البتہ داعش، تحریک طالبان پاکستان اور القاعدہ جیسی دہشتگرد تنظیموں کے جرائم پیشہ گروہوں سے تعلقات کے بارے میں تب تک وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا جب تک اس کے واضح ثبوت نا سامنے آجائیں۔ قومی سطح سے بین الاقوامی سطح تک دہشتگردی نے سب پر کسی نا کسی شکل میں اثرات چھوڑے ہیں۔ البتہ عالمی سطح پر مختلف کاروباروں پر اس کے منفی اثرات مرتب ہونے کی بجائے مثبت اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کہنا غلط نا ہوگا کہ آج کی دنیا میں دہشتگردی عالمی معیشت کو چلانے کا ایک ذریعہ بن چکی ہے۔ اس لئے دہشتگردی میں اضافے کے باوجود عالمی معیشت ٹھیک نظر آتی ہے، اور اسی وجہ سے یہ کہنا درست ہے کہ دہشتگردی ایک کاروبار ہے۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی
حیثیت سے کام کر رہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

# خطرات سے کیسے نمٹا جائے؟

تحریر: عدنان بابر

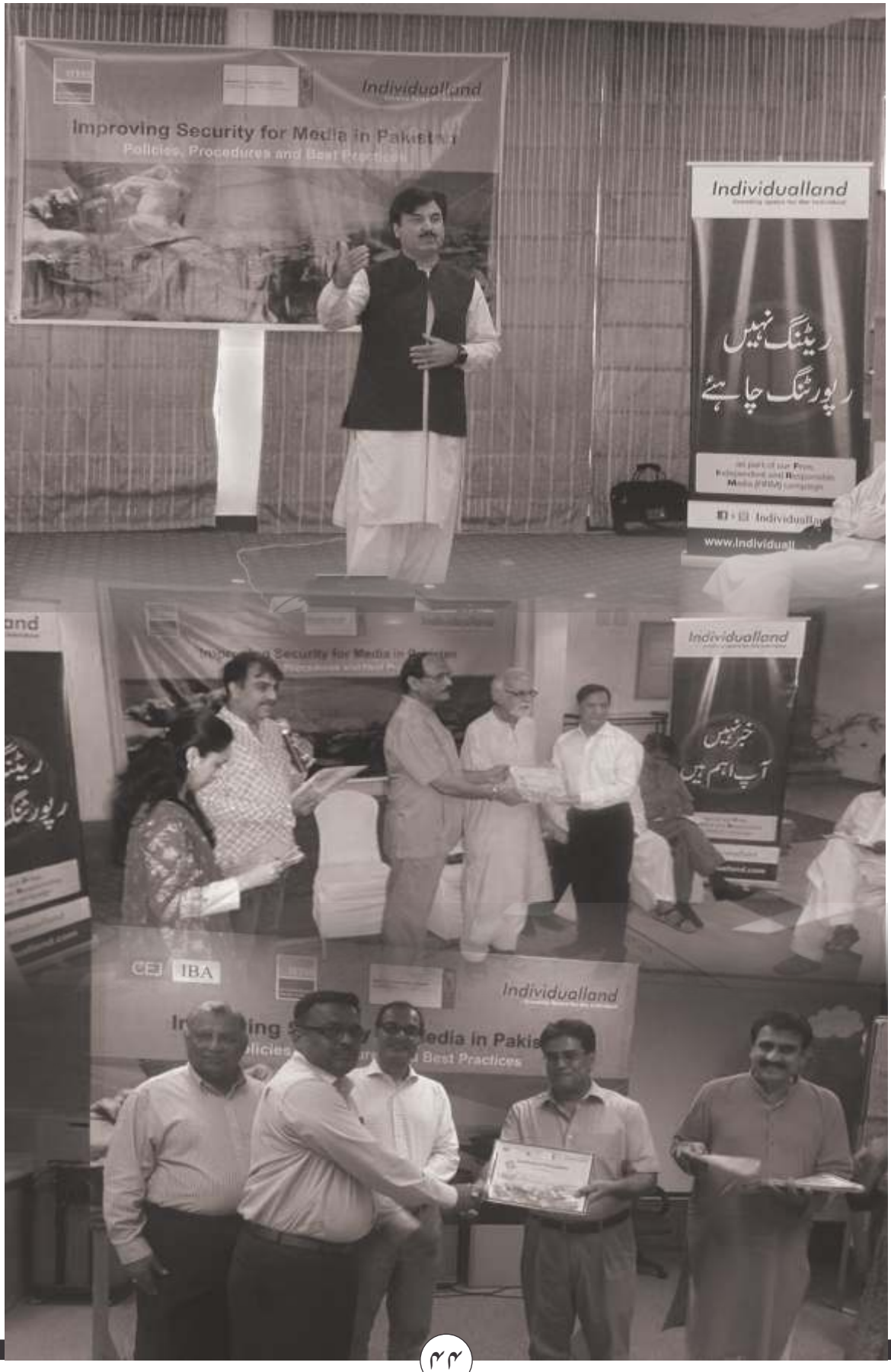

پاکستان میں تو میڈیا کا یہ حال ہے کہ ان کو سچ دیکھانا بھی مہنگا پڑ سکتا ہے اور سچ چھپانا بھی ان کے لیے خطرے سے خالی نہیں، ابھی چند ہفتوں پہلے ہی ایک سیاسی جماعت کی جانب سے پہلے تو پریس کلب کے باہر دھرنا دیا گیا، پھر اس دھرنے کی کوریج نہ کرنے کی پاداش میں میڈیا کے اداروں ہر دھاوا بول دیا گیا۔ اس سلسلے میں وزیرِ اعظم نے بھی میڈیا کے ادارے پر حملے کی مزمت کی، اسی سلسلے میں پنجاب اسمبلی میں مذمتی قرار دادیں بھی جمع کروائی گئیں ہیں۔ میڈیا کے اداروں اور نمائندگان کو ہمیشہ نشانہ بنایا جاتا رہا ہے ان کو نہ صرف ہراساں کیا جاتا ہے بلکہ انہیں دھمکیوں، پرتشدد حملوں، اغوا اور گرفتاریوں وغیرہ کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر میڈیا کے اداروں پر حملے کی بات کی جائے تو ۲۰۰۹ء میں پشاور پریس کلب پر خودکش حملہ ہوا، ۲۰۱۶ء میں حیدر آباد اور کراچی پریس کلب، آج نیوز کراچی اور لاہور کے دفاتر پر مشتعل افراد کی جانب سے حملہ کیا گیا، ۲۰۱۴ء میں اسلام آباد میں دھرنے کے دوران جیو نیوز اور پاکستان ٹیلی ویژن کے دفاتر پر حملہ ہوا۔ اس کے علاوہ ۲۰۱۶ء میں لاہور میں ہی اب تک چینل اور آج نیوز کی ڈی ایس این جی وین پر بھی پتھراؤ کیا گیا۔ ۲۰۱۵ء کو جیو نیوز کی ڈیجیٹل سیٹلائیٹ نیوز وین پر کراچی میں نامعلوم افراد نے فائرنگ کی جس کے نتیجے میں سیٹلائٹ ٹیکنیکل انجینئر ہلاک اور ڈرائیور زخمی ہو گیا۔ ۲۰۱۵ء کو کراچی میں عیسیٰ نگر کے علاقے میں ڈان نیوز کی ڈیجیٹل سیٹلائیٹ نیوز وین پر نامعلوم افراد نے فائرنگ کی جس کے نتیجے میں عملے کا ایک ممبر زخمی ہو گیا۔ اس تمام صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ میڈیا ہاؤسز کے احاطے، ڈی ایس این جی، اور پریس کلب ابھی بھی خطرات کی زد میں ہیں، اور انہیں ممکنہ حملے سے محفوظ رکھنے کے لئے فوری طور پر بھرپور حکمت عملی ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ رپورٹروں، نامہ نگاروں، کیمرہ مین، فوٹو گرافروں، ایڈمن، مینیجمنٹ، ہیومن ریسورس اور دیگر عملے کے لیے تحریری طور پر معیاری ہدایات موجود نہیں ہوتیں اور نہ ان کو تربیت دی جاتی ہے۔ صحافتی اداروں کے تحفظ کے لیے انڈو یجوئل لینڈ کی جانب سے لاہور، پشاور، کراچی، کوئٹہ اور اسلام آباد میں دو دو روزہ تربیت کا انعقاد کیا گیا جس میں **'ذرائع ابلاغ کے اداروں کو محفوظ بنانا: حکمت عملی اور طریقہ کار'** نامی مینوئل کے ذریعے شرکاء کو حفاظتی اقدامات سے متعلق ضروری معلومات فراہم کی گئیں۔ اس مینوئل کو ترتیب دینے کا سہرا بھی انڈو یجوئل لینڈ کے سر ہے جو پچھلے کئی سالوں سے خیبر پختونخواہ اور بلوچستان سے تعلق رکھنے والے صحافیوں کو حفاظتی اقدامات پر مبنی تربیت فراہم کر رہا ہے۔ نا صرف یہ بلکہ صحافت کے طالب علموں کو بھی ان تربیتی پروگراموں کا حصہ بنایا جاتا ہے اور ادارے کی کوششوں سے اسی موضوع پر ایک کورس کو بھی ان کے نصاب کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ تربیت کے دوران صحافتی اداروں کے اہلکاروں نے ادارے، پریس کلب اور نیوز روم کے لیے سٹینڈرڈ آپریٹنگ پروسیجرز بھی بنائے۔ ''سٹینڈرڈ آپریٹنگ پروسیجرز سے مراد وہ تحریری ہدایات ہیں جو کسی بھی مخصوص کام کے حصول کے لیے وضع کی جاتی ہیں۔'' ایس او پیز وضع کرتے ہوئے ان باتوں کو مدِ نظر رکھا گیا کہ:

۱۔ ممکنہ خطرات کا کیسے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔
۲۔ خطرات سے نمٹنے کے لیے کیا اقدامات اٹھانے چاہیئیں۔
۳۔ کسی بھی امور کو سرانجام دینے کے لیے ذمہ دار افراد کا تعین۔
۴۔ اقدامات اٹھانے کے لیے باقاعدہ تربیت کی ضرورت تا کہ سکیورٹی پالیسی کا نفاذ ممکن بنایا جا سکے۔

اسی سلسلے میں مختلف صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے خطرے کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے میڈیا کے نمائندگان نے گروپوں کی صورت میں کام کرتے ہوئے خطرے کو کم کرنے کے لیے حل بھی تلاش کیے گئے۔ مثال کے طور پر شارٹ سرکٹ ہونے کی وجہ سے عمارت میں آگ لگ جانا، حملہ آور کی جانب سے عمارت میں دھماکہ خیز مواد کا دھماکہ، میڈیا کی ڈی ایس این جی وین پر مشتعل مظاہرین کا حملہ یا پھر عمارت کے قریب دھماکہ کی صورت میں کن اشیاء اور کن اقدامات کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میڈیا کے نمائندگان اس بات سے آگاہ ہوں کہ اگر ان کی عمارت ایک کمرے پر بھی مشتمل ہے تو اس کے لیے بھی پہلے خطرے کی تشخیص کرنا نہایت اہم ہے۔ اس حوالے سے سیکیورٹی ایکسپرٹ نے باقاعدہ تربیت دی تا کہ ایس او پیز بنانے میں ان کو مدد مل سکے۔ ایک اور اہم بات جو میڈیا کے نمائندگان کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ وہ کسی بھی ایسی اسائنمنٹ سے انکار کر سکتے ہیں جہاں ان کو معلوم ہو کہ ان کی جان کو خطرہ ہے۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہے کہ انکار کی کوئی سورت موجود نہ ہو کیونکہ بے شمار ایسے میڈیا نمائندگان آپ ہی کے درمیان موجود ہیں جو خطرناک اسائنمنٹ سے انکار کے باوجود اپنا کام نہایت موثر انداز میں کر رہے ہیں۔ انکار کرنا آپ کا حق ہے اس حق کو پہچانیئے اور اس کا استعمال کیجئے۔

شرکاء نے مندرجہ ذیل نکات ایس او پیز کی صورت میں پیش کیے جن پر عمل درآمد ہونا نہایت ضروری ہے۔

☆ ڈیجیٹل سیفٹی کے بارے میں صحافیوں اور میڈیا ہاؤسز کو تربیت فراہم کرنا نہایت اہم ہے۔

☆ میڈیا ہاؤسز کو مخصوص خطرات سے پیشگی نمٹنے، خطرناک عوامل اور جانی خطرات کے ذرائع کے بارے میں حسب ضرورت معلومات اور ہدایات کی فراہمی نہایت اہم ہے۔

☆ ڈی ایس این جی وین، ادارے کے احاطے اور فیلڈ میں کام کرنے والے عملے کے لیے الگ الگ سامان کی فراہمی کے ساتھ ساتھ اس سامان کو استعمال کرنے کے طریقہ کار کے موجود ہونے، اس سامان کے استعمال کی تربیت اور ایمرجنسی کی صورت میں امور کس نے انجام دینے ہیں ان سب باتوں کا تعین سٹینڈرڈ آپریٹنگ پروسیجرز میں واضع ہونا چاہیے۔

☆ مثال کے طور پر ایمرجنسی الارم، ہنگامی راستہ، ایمرجنسی نمبر (ڈائلنگ)، سر کو بچانے کے لیے ہیلمٹ، بلٹ پروف جیکٹ، گیس ماسک، فرسٹ ایڈ کٹ، مواصلاتی آلات، ایمرجنسی ڈرل، آگ بجھانے کے آلات مہیا کیئے جانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل باتوں کو مدِ نظر رکھا جائے:

☆ اگر آگ بجھانے کے آلات درکار ہیں تو احاطے کے اندر، باہر اور گاڑی کے لیے الگ الگ آلات کی ضرورت ہوگی۔

☆ اگر بلٹ پروف جیکٹ کی ضرورت ہے تو وہ علاقے کے حساب سے ہلکی اور بھاری پلیٹ والی مختلف جیکٹ موجود ہیں۔ جیسے کہ جنگ زدہ علاقے میں جانے کے لیے زیادہ بھاری جیکٹ کی ضرورت ہوگی۔

☆ احاطہ کے تحفظ کے لیے شیٹر پروف کھڑکیاں، مہمانوں کے اندراج کا رجسٹر، دروازے کے تالوں کی مرمت، سامان کی انشورنس، خاردار تاریں، واک تھرو گیٹ

☆ الیکٹرانک سکیورٹی میں سی سی ٹی وی کیمرے، کیمرے کی مانیٹرنگ کے لئے عملہ، سکیورٹی الارم اور اس کی مرمت ضروری ہے۔

☆ میڈیا کے نمائندگان کو ان کے متعلقہ ذرائع ابلاغ کے ادارے کی حمایت حاصل ہو۔

☆ صحافیوں، کیمرہ مینوں اور دیگر فیلڈ کے عملے کے لئے حساس موضوعات پر تربیت کا انتظام خاص طور پر تصادم کی رپورٹنگ وغیرہ۔

☆ تصادم و تنازعات (جس میں بم دھماکے، لڑائی جھگڑے اور اغوا کے واقعات وغیرہ شامل ہیں) کی رپورٹنگ کرنے کے لئے فیلڈ اور ڈیسک کے نمائندگان کے پاس سٹینڈرڈ آپریٹنگ پروسیجرز (ایس او پیز) موجود ہونے چاہئیں۔

☆ اداراجاتی سطح پر لاحق خطرات جاننے کے لیے کوئی نظام موجود نہیں ہے۔

☆ خطرناک نوعیت کے کام تفویض کرنے سے پہلے میڈیا کے نمائندگان کو پر خطر ماحول سے نبٹنے اور خطرے سے آگاہی کی تربیت نہیں دی جاتی۔

☆ کسی بھی واقع کی جگہ پر پہنچنے کے لئے محفوظ راستوں کے بارے میں فیلڈ کے اسٹاف آگاہ ہونے چاہئیں اور ان کے پاس مقامی نقشہ جات موجود ہونے چاہئیں۔

☆ عملے کی ہدایات میں شامل ہو کہ حادثہ کے بالکل قریب گاڑی کھڑی کرنے سے پرہیز کریں۔

☆ ان کو تربیت دی جائے کہ جگہ کا انتخاب کیسے کرنا ہے جہاں سے واقعہ یا حادثہ کو آسانی سے دیکھ سکیں لیکن اس بات کا یقین ہو کہ آپ حادثے کی جگہ سے دور اور محفوظ ہیں۔

☆ واقعہ کے متعلق باخبر رہنے کے لئے وہاں موجود حادثہ کو کنٹرول کرنے والے افراد سے رابطہ رکھیں۔

☆ حفاظتی تدابیر کے مسودہ کو دیواروں اور نمائندگان کے میزوں پر چسپاں کریں۔

☆ اس بات کو یقینی بنائیں کہ حفاظتی تدابیر تحریری طور پر تمام میڈیا نمائندگان کو ای میل کر دی گئی ہیں۔

☆ اس بات کو یقینی بنائیں کہ تمام نمائندگان نے وہ تمام مسودہ پڑھ لیا ہے، اس کا اندازہ ان سے رسمی ٹیسٹ یا انٹرویو لے کر لگایا جا سکتا ہے۔

☆ تصادم زدہ علاقوں میں کام کرنے والے نمائندگان کو تحریری پیغام کے ذریعے حفاظتی تدابیر بھیجی جائیں۔

☆ کتابچہ کی شکل میں مطبوعہ حفاظتی تدابیر تمام سٹاف کو فراہم کی جائیں۔

☆ فسٹ ایڈ کٹ اور حفاظتی سامان (ماسک، بلٹ پروف جیکٹ وغیرہ) فیلڈ میں جانے والے عملے کے پاس موجود ہونی چاہیئے۔

☆ کیمرہ مینوں کو ہدایت واضح جاری کی جائیں کہ وہ بالکل قریب جا کر فوٹیج نہ بنائیں بلکہ زوم کریں۔

☆ ذرائع ابلاغ کے اداروں میں ایک مخصوص شعبہ ہونا چاہیئے جو نمائندگان یا ادارے کو موصول ہونے والی دھمکیوں سے نبرد آزما ہو۔ اس شعبے کو محتاط طریقے سے موصول ہونے والی دھمکیوں کی نگرانی کرنی چاہیئے اور اس کے پاس ایسی ٹیکنالوجی اور دیگر وسائل موجود ہوں تاکہ وہ خطرات سے نمٹنے کے لیے معاونت فراہم کر سکیں۔

☆ ذرائع ابلاغ کے ادارے اپنے فیلڈ کے عملے کو ایمرجنسی ہاٹ لائنز سے آگاہ رکھیں جیسے پولیس، ایمبولینس وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہاٹ لائنز اور ایمرجنسی نمبرز فیلڈ کے عملے کے موبائل میں بھی ہونے چاہئیں۔

☆ ادارے کے احاطے میں اور فیلڈ کے عملے کے لیے بنیادی حفاظتی سامان میسر ہونا چاہیئے اور اس کو استعمال کی باقاعدہ تربیت بھی ہونی چاہیئے۔

☆ شورش زدہ علاقے میں داخل ہونے سے پیشگی باہر نکلنے والے راستے اور ذرائع کا پتہ معلوم ہونا ڈرائیور کے لیے نہایت ضروری ہے۔

☆ ابتدائی طبی امداد بالخصوص خون روکنے کے طریقوں کا علم ہونا چاہیئے۔

☆ کسی بھی حالت میں ہتھیار ساتھ نہ رکھیں اور نہ ہی کسی ایسے لوگوں کے ساتھ رہیں جس کے پاس کوئی ہتھیار ہو۔

☆ اگر کسی اندوہناک صورتحال کا سامنا ہو جائے تو میڈیا کے نمائندہ ہونے کی شناخت کو نہ چھپائیں۔

☆ بریسلٹ یا ٹیگ پہنے رکھیں جس پر آپ کے خون کا گروپ لکھا ہو۔

☆ ٹریکنگ چپ عملے کو مہیا کی جائے تاکہ فیلڈ میں جانے والے عملے کو ٹریک کیا جا سکے۔

☆ ایڈیٹر خاص طور پر ان باتوں کو یقینی بنائے کے ہر فیلڈ رپورٹر تصادم زدہ علاقے میں جانے کے لیے رضامند ہو۔ زیرِ تربیت یا غیر تربیت یافتہ رپورٹر کو متنازعہ علاقے میں رپورٹ کرنے کے لیے نہ بھیجا جائے اور فیلڈ سٹاف کی انشورنس کروائی جائے۔

☆ متنازعہ علاقوں میں کام کرنے والے عملے کے لیے ٹراما سنٹر ہونے چاہیئے۔

☆ ایس او پیز پر عمل نہ کرنے کی صورت میں جرمانہ ہونا چاہیئے۔

☆ ادارے کی پالیسی ریاستی پالیسی سے متصادم نہ ہو۔

☆ تحفظ کے سامان کے لیے بجٹ مختص کیا جانا چاہیئے۔

☆ سال میں دو مرتبہ پالیسی پر عمل درآمد ہونے پر نظر ثانی کی جانی چاہیئے۔

یہ وہ ایس او پیز ہیں جو میڈیا کے نمائندگان نے انڈوبجوئل لینڈ کی جانب سے منعقد کروائی گئی ورکشاپ میں وضع کیئے جن کو میڈیا کے اداروں کو بھیجا جائے گا۔ کچھ ادارے ایسے بھی ہیں جن کے ایس او پیز موجود ہیں ان سے بھی ان ایس او پیز پر سفارشات لی جائیں گی اور ان کو الیکٹرانک پمفلٹ کی صورت میں تمام اداروں کو بھیجا جائے گا۔ یہ ایس او پیز اس یقین کے ساتھ وضع کیئے گئے ہیں کہ میڈیا کے نمائندگان اس پر عمل درآمد کروانے کے لیے اپنے اداروں سے بات کریں گے اور خود بھی اس پر عمل پیرا ہوں گے۔ اگر کسی صحافی کی جان کو خطرہ ہو یا ان کو دھمکی موصول ہو تو وہ میڈیا سکیورٹی حب جو کہ ۶ شہروں میں قائم کیے گئے ہیں ان کو دی جا سکتی ہے۔

اطلاع دینے کے لیے میڈیا حب مینیجرز سے رابطے کا پتہ درج ہے یا پھر انڈیویجوئل لینڈ کو info@individualland.com پر اطلاع کریں۔

سیفٹی حب: کراچی پریس کلب
مینیجر: غلام مصطفیٰ
موبائل: 0334-3998485
ای میل: geomustafa@gmail.com

سیفٹی حب: لاہور پریس کلب
مینیجر: علی گوہر بٹ
موبائل: 0321-4431826
ای میل: aligoharbutt@gmail.com

سیفٹی حب: نیشنل پریس کلب اسلام آباد
مینیجر: سعید احمد
موبائل: 0333-5111640
ای میل: saeed.media@gmail.com

سیفٹی حب: کوئٹہ پریس کلب
مینیجر: ایوب ترین
موبائل: 0333-7813435
ای میل: ayubtareenbbc@yahoo.com

سیفٹی حب: پشاور پریس کلب
مینیجر: گوہر علی
موبائل: 0345-9054540
ای میل: aligoh@gmail.com

سیفٹی حب: ڈیرہ پریس کلب
مینیجر: فضل الرحمان
موبائل: 0335-5170783
ای میل: fazaldik@gmail.com

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام مینیجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

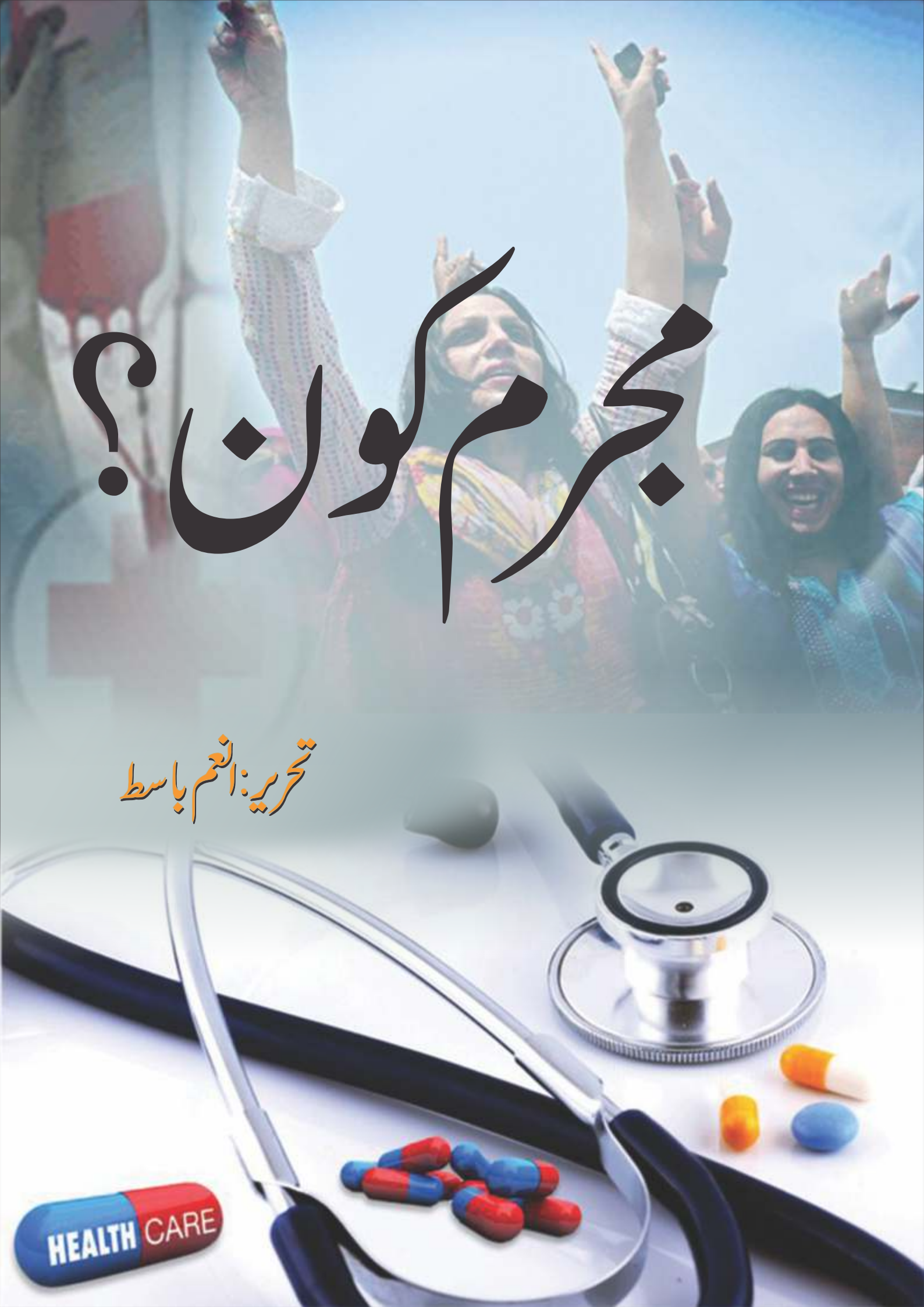
مجرم کون؟
تحریر: انعم باسط
HEALTH CARE

پرانے وقتوں کی بات ہے جب تیسری صنف کو محلوں میں وزراء کے ساتھ حکومتی پیشوں میں ہاتھ بٹانے کے لیے رکھا جاتا تھا یا پھر یہ رانیوں اور شہزادیوں کا خیال رکھنے کے لئے ان کا تقرر کیا جاتا تھا۔ اس برادری کی یہ ہمیشہ سے بدقسمتی رہی ہے کہ ان کو معمولی کاموں تک ہی مخصوص رکھا گیا ہے۔ کسی بھی دور میں ان کو عام شہریوں کے حقوق حاصل نہیں رہے لیکن آج کا دور ترقی یافتہ دوران کو مزید تنزلی کا شکار کرتا جا رہا ہے۔ پاکستان میں رہتے ہوئے ہمارے اور آپ جیسے شہری ہوتے ہوئے بھی ان کو ہمارے جیسے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ یہ ناروا رویہ ان سے ہر طریقے سے برتا جا رہا ہے۔ پہلے تو محلوں میں رہتے ہوئے کام کاج کرتے ہوئے یہ ممکن تھا کہ ان کے سر پر چھت تھی، تن ڈھانپنے کو کپڑا تھا اور کھانے کو دو وقت کی روٹی مل جاتی تھی۔ پر اب لوگ ان کو اپنے گرد و نواح میں بھی برداشت کرنا ناگزیر سمجھتے ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی الگ دنیا آباد کر لی ہے اور ہمارے معاشرے سے الگ تھلگ ہو کر رہنے لگے ہیں۔ لوگوں سے ملنا جلنا تو دور کی بات یہ بس اپنی ہی دنیا میں مگن رہتے ہیں الگ گھروں میں جہاں ان جیسے ہی لوگ ہوتے ہیں نہ تو ان کو ان کے گھر والے ساتھ رکھتے ہیں اور نہ ہی یہ ان کے ساتھ رہ سکتے ہیں کیونکہ ہمارا معاشرہ ہی ان کو قبول نہیں کرتا۔ ان کے گھر بھی ایسی جگہوں پر ہوتے ہیں جہاں پر جانا عام آدمی معیوب سمجھتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ ان کو الگ دنیا بسانے پر کس نے مجبور کیا؟ یہ برادری تعلیمی، معاشرتی اور سماجی دوڑ میں پیچھے کیوں رہ گئی؟ آخر یہ بھی ہماری آبادی کا حصہ ہیں، اگر ان کو معاشرتی، معاشی ترقی کی دوڑ میں شامل نہیں کریں گے تو یہ ملک و قوم کی ترقی میں بھی اپنا کردار ادا نہیں کر سکیں گے۔

حکومت کی جانب سے ان کے لیے چند حکومتی اقدامات کو سامنے آئے لیکن معاشرے میں وہ ان کو وہ عزت اور مقام نہ دلوا سکے جس کے وہ حق دار ہیں۔ اگر کسی بھی معاشرے میں تعلیم نہ ہو تو ان کو روزگار کے لیے کم سے کم پیشہ ورآنہ تربیت تو دی ہی جاتی چاہیئے لیکن یہ اس سے بھی محروم ہیں۔ پہلے ادوار میں ان کا روزگار محلوں میں ناچنے گانے، یا شادی بیاہ پر ناچ گا کر پیسہ کمانے سے منسلک تھا، لیکن پھر یہ دور بھی بیت گیا اور ان کو بھکاریوں کا پیشہ اپنانا پڑا۔ ہر چوک اور سگنل پر ہمیں بھکاری کے روپ میں مخنث دیکھائی دینے لگے۔ لیکن ان کے ساتھ وہاں بھی ناانصافی یہ ہوئی کہ ان کا یہ پیشہ ان مخنث نے چرا لیا جو دراصل بہروپیے تھے۔ اسی سلسلے میں ہم نے جب اسی برادی کے چند لوگوں سے بات کی تو انہوں نے بیان کیا کہ روٹی روزی کمانے کے لیے چند تیسری صنف کے گروہوں نے غیر قانونی طریقے کا سہارا لیتے ہوئے جنسی کاموں سے پیسہ کمانے کو ذریعہ معاش بنا لیا۔ انہوں نے مزید بتایا کہ ہمارے وہ گرو جو ادھیڑ عمر کو پہنچ جاتے ہیں وہ ناچ گا نہ نہیں کر سکتے نہ ہی کوئی اور کام کر سکتے ہیں وہ بھی اب اس دھندے میں ملوث ہو گئے ہیں کہ وہ ہم سے ناجائز کام کرواتے ہیں اور پیسہ کماتے ہیں۔ ہماری اس مجبوری کا فائدہ دراصل معاشرے کے وہ افراد اٹھاتے ہیں جن کی بظاہر معاشرے میں عزت ہے۔ ان کے ان معیوب کاموں پر بحر حال پردہ پڑا رہتا ہے اور ہم جیسی برادری جو پہلے ہی مقام اور عزت سے محروم ہے مزید محرومیوں کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔

بھوک، ننگ، تنگدستی، افلاس بہت بری شے ہے یہ لوگوں کو کوئی بھی بڑا راستہ اپنانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس جنسی کاموں میں بھی انہیں بیشتر تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن میں سے ایک آختہ کاری ہے جو کہ نہایت خطرناک اور تکلیف دہ عمل ہے۔ جو کہ ان کو ایک صحت مند زندگی جینے سے مرحوم کر دیتا ہے اگر اس کے طویل مدتی نتائج پر نظر رسائی کی جائے تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اس کی بدولت ان کو بے شمار بیماریاں لاحق ہونے کا اندیشہ دکھائی دیتا ہے جس میں زخموں کا دیر سے ٹھیک ہونا، انفیکشن اور یرقان وغیرہ کا ہو جانا شامل ہیں۔ ان کو ان مسائل کا سامنا اس وجہ سے کرنا پڑتا ہے کیونکہ اس کام کو چند ہزار روپوں کی خاطر گھر پر انجام دیا جا رہا ہے۔ جس میں گھروں پر ہی مختلف اوزاروں اور ہلدی وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے جو کہ صحت کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جراثیم سے پاک نہیں کیئے جاتے جن کی بدولت ایک سے دوسرے کو بیماریاں لگنے کا زیادہ خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

ایک وہ دور تھا جب چند ممالک میں یہ عمل سزا کے طور پر مجرموں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ لیکن اب اگر یہ کام گھروں پر اس برادی کے لوگ غلط کاموں میں ملوث ہونے کے لیے کروا رہے ہیں تو اس پر میرا حکومتی اداروں سے سوال ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ یہ وہ افراد ہیں جن کو پہلے ہی صحت کی سہولیات میسر نہیں ہیں لیکن اس سورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے وزارتِ صحت کو چاہیئے کہ اس کا نوٹس لیں اور اس عمل کی روک تھام کے لیے مناسب اقدامات اٹھائے جائیں۔ اگر حکومت کی جانب سے یہ برادری اسی طرح

عدم توجہ کا شکار رہی تو پھر علیشہ جیسے کئی مخنث برادری کے افراد ہسپتالوں تک پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیں گے۔ پاکستان میں آختہ کاری کی ایک مثال ہمیں گجرانوالہ کے علاقے سے بھی ملتی ہے جہاں ایک جعلی پیر نے ایک دوسالہ بچے کو آختہ کاری کا نشانہ بنایا۔ بقول اس پیر کے وہ اس کو اپنی طرح ملنگ بنانا چاہتا تھا لیکن تحقیق کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ وہ اس سے پہلے عصمت دری اور مخنث برادری کے جنسی گروہ میں بھی ملوث رہ چکا ہے۔ اگر اس طرح سرِعام ایسے جعلی پیر عام انسانوں کو اپنے گندے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں تو یہ کس کا قصور ہے۔ اور اگر سرِعام یہ کام کیا جا رہا ہے تو ہمارے ذمہ دار اداروں کی غیر ذمہ داری پر کون سوال اٹھائے گا؟ مخنث برادی کے افراد کا کہنا ہے کہ اسی عزت دار معاشرے کے باعزت افراد ہمیں اپنی ہوس اور جنسی تشدد کا نشانہ بناتے ہیں لیکن اس صورت میں بھی جب ہم قانون کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں تو ہمیں وہاں پر بھی انصاف نہیں ملتا اور وہاں پر بھی ہماری مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ حکومت کی جانب سے چند قوانین پاس کر دینے سے کیا اس تیسری برادری کو وہ عزت اور مقام مل سکتا ہے جو کہ ان کا بطور ایک شہری حق بنتا ہے؟

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی
حیثیت سے کام کر رہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

# دی وسل بلوئر بل

تحریر: حور کاکڑ

گڈ گورننس کے قیام و بقاء کے لیے حکومت اور عوام کو مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کرپشن کے خاتمے کی ذمہ داری محض حکمرانوں کے سر نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں عوام کو بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہیئے۔ تاہم حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ عوام کو بہتر نظام فراہم کرے جس کی بدولت وہ ذمہ دار شہری ہونے کا ثبوت دے سکیں۔ کرپشن کسی ایک ادارے یا کسی ایک سطح تک محدود نہیں ہے بلکہ سرکاری اور نجی اداروں میں کسی بھی سطح پر کرپشن ہوسکتی ہے۔ کسی بھی ادارے کے منتظم سے لے کر چوکیدار تک کرپشن کی وبا پھیلی محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہ ایسا طاعون ہے جس کا واحد حل حکومت کے پاس ہے۔ حکومت کو چاہیئے کے لاگو کردہ قوانین میں عوام کی ذمہ داریوں کو واضح کرے۔ جن قوانین کے تحت حکومت کرپشن کو مٹانا چاہتی ہے، ان قوانین میں ایک ذمہ دار شہری کا کردار بھی واضح کرنا چاہیئے۔ ریاست کا کام ہے کہ قوانین منظور کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو لاگو بھی کرے۔ قوانین کے نفاذ میں حکومت کے ساتھ ساتھ عوام کی جانب سے بھی جانچ پڑتال کرنا ضروری ہے۔

## ہم کرپشن سے کیسے نمٹ سکتے ہیں؟

### وسل بلوئر متعارف کروا کر!

وسل بلوئر کوئی بھی ایسا فرد ہوسکتا ہے جو کسی بھی ادارے میں ہونے والی غیر قانونی سرگرمیوں کو رپورٹ کرتا ہے، اور اس طرح وہ حکومت کو جانچ پرتال کرنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ تاہم، کسی بھی ادارے میں ہونے والی غیر قانونی سرگرمیوں کے بارے میں معلومات فراہم کرکے وسل بلوئر اپنے آپ کو خطرے میں ڈال سکتا ہے۔ لہذا، حکومت کا شہریوں کو وسل بلوئر ہونے کی ذمہ داری دینے کے ساتھ ساتھ اس ایکٹ میں ان کے تحفظ کی شق ڈالنا بھی نہایت ضروری ہے۔ یقیناً وقت کی ضرورت بھی یہی ہے اور اس شق کی بدولت یہ ممکن بنایا جاسکے گا کہ شہری ایک فعال طریقے سے ہوکر کرپشن کے خاتمے کے لیے اپنا کردار ادا کرسکیں گے۔

جنوبی ایشیاء کے خطے میں پہلی بار وسل بلوئرز ایکٹ ۲۰۱۰ء میں بنگلہ دیش کی حکومت نے منظور کیا۔ اس قانون کو کامیاب بنانے اور اس کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ رپورٹ کرنے والے (یعنی وسل بلوئر) کی شناخت کو ظاہر نہ کیا جائے، اور اس کے ساتھ ساتھ اس کو یا اس کے روزگار کو سول اور عدالتی کارروائی سے کوئی نقصان نہ ہو۔ ۲۰۱۴ء میں بھارت نے وسل بلوئر کے تحفظ کے لیے بل پاس کیا۔ حکومت کی جانب سے اٹھائے گئے ان اقدامات کو عوام کی جانب سے سراہا جاتا ہے اور ان کو حوصلہ افزائی ملتی ہے کہ وہ سرکاری ملازمین کے اختیارات کے غلط استعمال یا غیر قانونی استعمال کے حوالے سے رپورٹ کرسکیں اور سرکاری دفاتر میں شفافیت کے پہلو کو یقینی بنانے میں اہم کردار ادا کرسکیں۔ عوام کو اس حوالے سے جتنی آگاہی ہوگی ان کو اپنے اردگرد ہونے والی کرپشن کو رپورٹ کرنے کی ذمہ داری کو محسوس کریں گے۔ اور ان لوگوں کو کسی بھی قسم کی کرپشن رپورٹ کرنے کے سلسلے میں تحفظ فراہم کرنا حکومت کا ایک حوصلہ افزاء قدم ہے۔

۲۰۱۵ء میں خیبر پختونخواہ کی حکومت نے خیبر پختونخواہ کے معلومات کے حق ۲۰۱۳ء میں تبدیلی کے ذریعے وسل بلوئر کے تحفظ کے لیے ایک بل متعارف کروایا ہے۔ اس کو صوبے میں کرپشن سے پاک نظام کے لیے ایک بہتر قدم سمجھا جاسکتا ہے، اس میں جانچ پڑتال کے نظام کو یقینی بنانے کے لیے یہ مجوزا قانون وسل بلوئر تحفظ اور نگران کمیشن بنانے کی تجویز بھی پیش کرتا ہے۔ کمیشن بدعنوانیت کے خلاف اٹھائی گئی آواز کی حوصلہ افزائی کرے گا جس کی بدولت گڈ گورننس اور شفافیت کو یقینی بنایا جاسکے گا۔ کمیشن کے مقاصد میں فرد کو کسی بھی نقصان دہ صورتحال سے بچانے اور ان کو تحفظ فراہم کرنا بھی شامل ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ بدعنوانیت کو رپورٹ کرنے پر فرد کو انعام بھی دیا جائے گا جبکہ غلط اطلاع دینے کی صورت میں سزا دی جائے گی۔ ایکٹ کے سیکشن ۱۶ اور ۱۷ میں قانون کے نفاذ کے لیے قوانین بنانا حکومت کی ذمہ داری ہے جبکہ کمیشن کی ذمہ داری ان قوانین کے نفاذ کو یقینی بنانا ہے۔

بل کے سیکشن ۵ کے تحت شفافیت کو یقینی بنانے اور کیس کی تفصیلی تحقیقات اور جانچ کے لیے تین رکنی کمیشن بنایا جائے گا۔ کمیشن مفادِ عامہ کی خلاف ورزی کے خلاف کاروائی

کرتے ہوئے حکام کو ممکنہ سفارشات پیش کرے گا۔ سیکشن ۹ کے تحت کمیشن کی جانب سے متعین کیے گئے افسر کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ وسل بلوئر کی شناخت کو صیغہ راز میں رکھے۔ اگر انکوئری افسر ضروری سمجھے کہ معاملے پر مزید تحقیقات کرنے کی ضرورت ہے تو کمیشن سے منظوری کے بعد مزید انکوئری کی جاسکتی ہے۔ اگر افسر یہ سمجھے کہ لگائے گئے الزامات بے بنیاد ہیں تو کمیشن کی منظوری سے انکوئری رکوائی جاسکتی ہے اور رپورٹ کرنے والے سے اس سلسلے میں مزید تحقیقات کی جاسکتی ہے۔

سیکشن ۱۱ کے تحت بل وسل بلوئر کی شناخت کو صیغہ راز میں رکھنے کی بات کرتے ہوئے وسل بلوئر کو قانونی تحفظ فراہم کرتا ہے۔ ایسی صورت میں جب وسل بلوئر کو ذاتی یا پیشہ ورانہ زندگی میں دھمکی کا سامنا کرنا پڑے تو وہ کمیشن کو رپورٹ کرسکتا ہے۔ کمیشن اس بات کو یقینی بنائے کہ وسل بلوئر کو کسی طور خطرے یا دھمکی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ سیکشن ۱۲ میں وسل بلوئر کے لیے درست رپورٹ کرنے پر انعامات اور بے بنیاد الزامات لگانے پر سزا کا ذکر کیا گیا ہے۔ وسل بلوئر کی شناخت ظاہر کرنے اور کمیشن کے ساتھ تعاون نہ کرنے کے سلسلے میں ہونے والے جرمانے کا ذکر بھی بل کے سیکشن ۱۳ میں کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس قانون میں بہت سی ترامیم کی ضرورت ہے پھر بھی یہ کرپشن کے خاتمے کی جانب ایک مثبت قدم ہے۔ اس قانون پر عمل درآمد کے لیے قانون پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ شکایت کنندہ کی جانب سے اس قانون کو غلط استعمال کرنے کی صورت میں جرمانے کی سزا شفافیت کے پہلو کو زیادہ مضبوط بناتی ہے۔ یہ قانون اقرباء پروری، رشوت ستانی اور اثر و رسوخ کے کسی بھی قسم کے غلط استعمال میں رکاوٹ پیدا کرے گا۔ کرپشن کا خاتمے کا سفر یقیناً بہت طویل ہے لیکن خیبر پختونخواہ کی حکومت کی جانب سے اٹھایا گیا یہ قدم کرپشن کے خاتمے کے مقصد کے حصول میں اہم کردار ادا کرے گا۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی
حیثیت سے کام کررہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

# سیا(ہ)ست؟

تحریر: ماریہ افتخار

ایک ایسا لفظ ہے جس کے آگے سب ہی ہاتھ باندھے کھڑے ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ سربسجود دیکھائی دیتے ہیں۔ زندگی کے ہر میدان میں اس لفظ کو نہایت اہمیت حاصل ہے۔ اور وہ لفظ ہے "سیاست"۔ اس لفظ سے وابستہ بے شمار اخلاقیات ہیں جو کسی گروہ پر لاگو ہوتی ہیں لیکن ہم سب نے مل کر اس ایک لفظ کا استعمال ایسے کیا کہ اخلاقی اقدار کو ہی روند ڈالا جس کی وجہ سے یہ لفظ منفی معنوں میں لیا جانے لگا۔ سیاست کو کسی بھی شے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہم کہتے تو ہیں کہ بچے غیر سیاسی ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے بچے سب سے اچھے سیاسی بیان دیتے ہیں۔ کبھی آزما کر دیکھ لیں!۔ پیشوں میں سیاست، کاروبار میں سیاست بات چیت کرنے کے انداز میں سیاست، گھر، دفتر، دوست رشتے دار اسی ایک لفظ کے منفی اور مفاد پرستانہ استعمال کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔

سیاست کے سیاہ ہونے میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنا کردار ادا کرنا چھوڑ دیا۔ کیونکہ ہم سوال کرنا بھول گئے ہیں یا ہم نے سوال کرنا سیکھا ہی نہیں اسی لیے آنکھوں دیکھی مکھی بھی نگل جاتے ہیں۔ ہم نے اس ایک لفظ کے ساتھ تمام منفی الفاظ یا کسی ایک مخصوص پیشے کو منسلک کرنا شروع کر دیا ہے۔ جیسے ہی سیاست کا لفظ استعمال ہوتا ہے یا تو ہمارے ذہن میں سیاست دان آتے ہیں، نظامِ سیاست یا پھر مکر و فریب، ظلم و ستم، انسانی حقوق کی پامالی، چال بازی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایسا نہیں ہے دراصل قصور ہمارا بھی ہے۔ سیاست کے لفظ کو کرسی سے منسوب کر دینا بالکل بھی مناسب نہیں ہے اسی طرح سیاست کو منفی الفاظ سے منسوب کرنا بھی بجا نہیں ہے۔ ہم کسی بھی پیشے کی بات کریں ہمیں سیاست نظر آتی ہے سرکاری ادارے ہوں تو سیاسی بھرتیاں، ٹانسفر اور پروموشن دیکھائی دیتی ہے اور اگر غیر سرکاری ادارے ہوں تو اس میں ریفرینس یا پھر نیٹ ورکنگ کے دوران ملنے والے لوگ نوازے جاتے ہیں۔ ہم نے بے شمار ایسے امور کو سیاست سے منسوب کرنا شروع کر دیا ہے جو درحقیقت سیاست نہیں ہے لیکن عہدوں پر بیٹھے ہوئے اپنی سیاست کو اپنی کرسی اور عہدے کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہوئے بے شمار ایسے امور سرانجام دیتے ہیں جس سے سیاست کو غلط سمجھا جاتا ہے۔

بات ہو لفظ سیاست کی اور سیاست دانوں کی سیاست کا ذکر نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے۔ آخر ذکر کیوں نہ ہو کھیل (سیاست) تو یہ سیاست دانوں کا ہی ہے ناں۔ یہ وہ ہی لوگ ہیں جو بظاہر جمہوری طریقے سے منتخب ہوتے ہیں اور ہمارے نمائندگان کہلاتے ہیں ہم ان سے اپنے ملک و قوم کو سنوارنے کے لیے بہترین فیصلوں کی توقع رکھتے ہیں۔ برسرِ اقتدار آ کر کوئی بھی شخص یہ سوچتا ہے کہ ہمارے پاس پسند ناپسند کے بے شمار انتخاب موجود ہیں لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ اکثر اوقات قدرت ہمیں اس جگہ پہنچا دیتی ہے جہاں جانے کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ویسے تو بہت سی مثالیں ہیں لیکن یہاں دو مثالیں رکھنا چاہوں گی ایک محترمہ شہید بینظیر صاحبہ کی مثال جنہوں نے شاید کبھی سوچا بھی نہ ہو کہ میں راولپنڈی کے ایک سرکاری ہسپتال میں علاج کے لیے جاؤں گی۔ کاش اس ہسپتال کو اس نیت سے بہترین سہولیات سے آراستہ کیا جاتا کہ وہاں سے ملک میں بسنے والے تمام لوگ سہولت اٹھا سکیں تو سیاست پر انگلی نہ اٹھتی۔ ستم صرف یہ ہی نہیں بلکہ ستم یہ بھی ہے کہ اس سانحے کے بعد بھی اس ہسپتال میں تبدیلی آئی تو وہ صرف نام تبدیل کرنے کی حد تک ہی تھی۔

اقتدار نہ جانے کیا ہے۔ اس کی طاقت اس کی حوس اور طلب کا تو مجھے نہیں معلوم بس مجھے اتنا معلوم ہے کہ اقتدار کا نشہ ایسے بھی ٹوٹتا ہے جب جہاز تباہ ہو جائے اور آپ کے کیے گئے بلند و بالا دعوے آپ سمیت نہ زمین کے رہیں نہ آسمان کے رہیں۔ لیکن کیا ہی بہتر ہوتا کہ اس دورِ حکومت میں کیے گئے جو غلط فیصلے تھے وہ بھی اس ڈھیر کے ساتھ دفن ہو جاتے۔ افسوس ایسا نہیں ہوا اس دور میں بوئے ہوئے خار ہم آج تک چن رہے ہیں۔ ہماری نسلیں ابھی تک اسی تباہی کے زیرِ اثر ہیں۔ شاید اس کے بعد کے کیے گئے فیصلوں میں وہ شدت اور وہ جذبہ ہی نہیں تھا کہ ایک غلطی کو سدھارا جا سکتا۔ اس ملک کے حالات کب تک غلط فیصلوں کی نظر ہوتے رہیں گے؟ ہم سوال کرتے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ کوششیں ہو رہی ہیں۔ کیا کوششیں ہو رہی ہیں اگر چیف جسٹس اور منسٹر کے بیٹے کو بازیاب کروا لیے جاتے ہیں لیکن ایک عام انسان کے بچوں کے جسم کے ٹکرے بیچنے والا مافیہ تک نہیں پکڑا جاتا۔ چلیں پھر یہ ذمہ داری بھی فوج کے کندھوں پر ڈال دیں۔ پولیو کے قطرے تک پلانے میں ہم فوج کی مدد طلب کرتے ہیں ویسے کہنے کو ہم ایک جمہوری ریاست ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ملک کے نظام کو چلانے کے لیے مل جل کر سب کام کر رہے ہیں، وہ ایسے کہ میرا کام کوئی دوسرا کر رہا ہے اور میں کسی دوسرے کا کام سرانجام دے رہی ہوں۔ ہر ادارے کا یہ ہی حال ہے۔ فوج ایڈمسٹریشن کے امور سنبھالے ہوئے ہے، اور ایڈمسٹریشن کو ابھی تک معلوم نہیں کہ اس کے

ذمے کون سے امور ہیں۔آپ سوچ رہے ہوں گے کہ کیا فوج اس لفظ سیاست کے منفی اثرات اور کھیل سے پاک ہے۔نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہے۔کرسی، اقتدار اور طاقت جس کے پاس بھی ہے اس نے کوشش کی ہے کہ اس ملک سے جتنا ذاتی فائدہ وہ اٹھا سکیں اٹھا لیں۔فوج کے بھی چند کیس ایسے ہیں جہاں زمینوں پر ناجائز قبضے کرنے کی اطلاعات ہم سنتے رہتے ہیں۔ہم میں سے کوئی بھی گنگا نہایا ہوا نہیں ہے لیکن ملک کی سلامتی اور خوشحالی کے لیے کام نہ کرنا اور ملک کے مفاد میں خالی نعرے لگانا بھی ایسا ہی ہے جیسے ملک میں بیٹھ کر مردہ باد کے نعرے لگانا، پھر تو دونوں مجرموں کا ایک جیسا انجام ہونا چاہیئے ناں؟

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی
حیثیت سے کام کر رہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

# ریفرنس


ریفرنس آرٹیکل دہشتگردی ایک کاروبار

http://www.usatoday.com/story/money/business/2013/03/10/10-companies-profiting-most-from-war/1970997/

http://www.dawn.com/news/1277182

http://nation.com.pk/national/22-Aug-2016/finance-ministry-releases-rs100m-for-cpec-security

ریفرنس آرٹیکل مردم شماری

https://www.thenews.com.pk/archive/print/634882-govt-decides-to-conduct-population-census-after-15-years

http://nation.com.pk/national/15-Dec-2013/hope-for-long-awaited-population-census-arises

http://www.dawn.com/news/1249639

http://www.referenceforbusiness.com/small/Bo-Co/Census-Data.html#ixzz4KcibzLja

http://www.finance.gov.pk/survey/chapters_15/10_Education.pdf

http://finance.gov.pk/survey_1314.html

ریفرنس آرٹیکل کیا یہ بھی جرم ہے؟

http://www.na.gov.pk/uploads/documents/1421399434_340.pdf

ڈان ۱۱ اگست ۲۰۱۶: http://www.dawn.com/news/1276662

ریفرنس آرٹیکل خیبر پختونخواہ پولیس آرڈیننس

http://tribune.com.pk/story/1165481/k-p-police-ordinance-2016/

http://kppolice.gov.pk/ordinance2016/

https://www.youtube.com/watch?v=xBfybP-GyWo&feature=youtu.be

ریفرنس آرٹیکل اسکولوں کا کردار

https://pakturk.edu.pk/

http://www.dw.com/en/secular-pakistanis-resist-turkeys-authoritarian-demands/a-19427773?maca=en-gk_volext_microsoft_topstories-13226-xml-atom

ریفرنس آرٹیکل: ڈی ایس این جی کا تحفظ

ڈان ۲۲ اگست ۲۰۱۶ء: http://www.dawn.com/news/1279242

کمیٹی ٹو پروٹیکٹ جرنلسٹ: https://www.cpj.org/killed

ڈان ۲۲ اگست ۲۰۱۶ء: http://www.dawn.com/news/1208197

ڈان ۱۸ اگست ۲۰۱۶ء: http://www.dawn.com/news/1276205

ریفرنس آرٹیکل پیارے افغانستان کے نام

http://www.refworld.org/docid/47c3f3c412.html

http://www.dawn.com/news/1188585

http://in.reuters.com/article/pakistan-afghanistan-refugees-idINKCN0Z91BX

ریفرنس آرٹیکل معلومات کا حق

http://www.kprti.gov.pk/

https://www.facebook.com/KPKRTI/

http://www.infokhyberpakhtunkhwa.gov.pk/doit/

http://www.rti.punjab.gov.pk/

ریفرنس آرٹیکل میڈیا اور صنفی دقیانوسی تصورات

http://blogs.tribune.com.pk/story/34510/aashi-the-struggle-of-a-transgender-in-a-mans-world/

http://www.mangobaaz.com/transgender-life-as-a-government-employee/

http://tribune.com.pk/story/945233/transgender-pakistanis-making-ends-meet/

http://www.dawn.com/news/1181702

http://www.etfo.ca/Resources/ForTeachers/Documents/Gender%20Issues%20in%20The%20Media.aspx

ریفرنس آرٹیکل مسترد کرنے کا حق

http://tribune.com.pk/story/530557/none-of-the-above-vote-to-be-added-to-ballots-ecp/

http://www.idea.int/vt/countryview.cfm?CountryCode=PK

http://articles.economictimes.indiatimes.com/2013-09-30/news/42536892_1_nota-dp-yadav-button

ریفرنس آرٹیکل وسل بلوئر بل

http://www.thedailystar.net/news-detail-155610

http://indianexpress.com/article/india/india-others/whistleblowers-protection-Bill-gets-presidents-nod/

http://www.dawn.com/news/1197732

# ادارے سے آگاہی

انڈوبیجوئل لینڈ پاکستان ایک متحرک، غیر جماعتی اور غیر منافع بخش رجسٹرڈ سول سوسائٹی ادارہ ہے۔اس کا بورڈ کل پانچ ارکان پر مشتمل ہے، جبکہ روزمرہ کے معاملات اس ادارے کے ڈائریکٹر کی ذمہ داری ہے۔ قیام سے لے کر آج تک اس ادارے نے حکومتی انتظامات، قانون کی بالادستی، میڈیا اور مراسلاتی، ہنر، سول سوسائٹی کے استحکام اور جمہوریت کی ترقی کے لئے کام کیا ہے۔

## شکیبیاں

## حکومت اور احتساب

## نوجوانوں سے متعلق

# اشاعت

## میڈیا سے متعلق

## تنازعاتی تجزیے اور انتہا پسندی کے خاتمے سے متعلق

## فرد میگزین

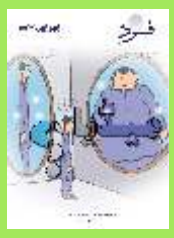
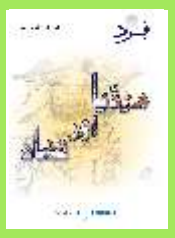

## پاکستان پولیس خواتین

اگلی اشاعت مئی ۲۰۱۷ میں

Find us
Individualland
Individualland